ہمارے سیاستدان

مرتبہ

مضطر ہاشمی

۱۹۴۹ء

پنجاب بک ایجنسی کشمیری بازار لاہور

بار اوّل

قیمت ۸ عہ

مضامین

(انصاف پریس لاہور)

پیش لفظ

مغرب میں سوانح نگاری کافی ترقی کر چکی ہے اور ادب کی ایک اہم صنف متصوّر ہوتی ہے۔ لیکن مشرق میں ابھی یہ ابتدائی حالت ہی میں ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اسے مغرب کی سوانح نگاری کے دوش بدوش کھڑا کرنے میں کتنی مدت لگے۔ سوانح نگاری کے ضمن میں ہماری اس پسماندگی کی وجہ یہ ہے کہ جہاں مغرب میں کسی شخصیت کے سوانح قلمبند کرتے وقت حالات و واقعات کی صحت کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ وہاں مشرق میں غیر ضروری مدح سرائی اور بے جا مدحت کو بھی ان میں شامل کر دیا جاتا ہے اور حالات اتنے مسنخ ہو جاتے ہیں کہ حقیقت سے انہیں بہت کم واسطہ رہ جاتا ہے۔

"ہمارے سیاست دان" کو ضبط تحریر میں لاتے وقت میں نے سوانح نگاری کے تقاضوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ کسی شخصیت کو اس کے مقام سے گرایا یا اٹھایا نہ جائے میں اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں یہ دیکھنا قارئین کا کام ہے!

(مضطر ہاشمی

جمال الدین افغانی

(۱)

اُنیسویں صدی کا زمانہ عالمِ اسلام کے لیئے بہت ہی منحوس وقت تھا۔ اسلامی ممالک کی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔ ہندوستان میں دو سو سال کی سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ مصر فرانس اور برطانیہ کے پنجہ میں پھنسا ہوا۔ ایران رُوس اور انگریزوں کی سیاسی چالوں کا شکار ہو رہا تھا۔

افغانستان کے حکمرانوں نے اپنی کم عقلیوں اور خود غرضیوں کے باعث افغان قوم کو دنیا کی نظروں میں حقیر بنا دیا تھا۔ غرضیکہ کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں تھا جو

اطمینان اور خوش حال ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہو۔ یوسی اور
نا اُمیدی کے اِس دَور میں افغانستان کے ایک مقام (کونر)
میں ایک بچّہ ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوا۔ جس کا نام اس کے
والد سیّد صفدر نے جمال الدّین رکھّا۔ کسی کو کیا علم تھا کہ
یہی ہونہار بچّہ ایک دِن آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر
چمکے گا اور مسلمانوں کی گئی ہوئی عظمت کو واپس دِلانے کا
ایک بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوگا۔

جمال الدین کے والد سیّد صفدر افغانستان کے ایک
بہت بڑے عالمِ دین تھے۔ اُنہوں نے اپنے بچّہ کی تعلیم و
تربیت بھی اپنے ڈھب سے کی اور اسی کوشش میں مصروف
رہے کہ جمال الدین بھی بڑا ہو کر انہی کی طرح عالمِ دین بنے
اور اسلام کی خدمت کرے۔

جمال الدین بلا کے ذہین تھے۔ اُنھوں نے صرف دس
برس کی عمر میں تمام علوم میں اتنی قابلیت پیدا کر لی۔ کہ
شاید کوئی تیس برس کی کوشش کے بعد بھی نہ کر سکتا۔

اس زمانہ میں افغانستان کا حکمران امیر دوست محمد
خان تھا۔ سیّد صفدر کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر اُن

کے خلاف ہو گیا - آہستہ آہستہ یہ مخالفت اِتنی بڑھی - کہ اُس نے سیّد صفدر کی تمام جائداد ضبط کر لی اور انہیں جلا وطن کر دیا - لگاتار دس برس کی مصیبتوں کے بعد سید صفدر کی قسمت نے پلٹا کھایا - امیر دوست محمد خاں نے ان پر سے تمام پابندیاں ہٹا لیں - اور اپنے وطن واپس آنے کی اجازت دے دی ؛

جمال الدّین نے اُنیس برس کی عمر تک کابل میں تعلیم حاصل کی - اِس اثنا میں اُن کے والد کا انتقال ہو گیا جمال الدین ویسے تو ہر قسم کے علوم حاصل کر چکے تھے - لیکن ابھی اُن کی پیاس نہیں بُجھی تھی - وہ غیر ممالک میں جا کر اپنے شوق کو پورا کرنا چاہتے تھے - چنانچہ ۱۸۵۶ء میں وہ ہندوستان آئے - اور کلکتہ میں قیام کیا ریاضی وغیرہ کی تعلیم حاصل کی- اُس وقت سلطنتِ مغلیہ کا چراغ ہندوستان میں بُجھ چکا تھا؛

عِلم کی تکمیل کے بعد سید صاحب حجاز - شام اور بیت المقدّس کی سیاحت کے لئے گئے - پھر عراق اور ایران سے ہوتے ہوئے واپس افغانستان پہنچ گئے - اِس سفر میں نہ صرف اُن کی علمی معلومات میں کافی اضافہ ہوا - بلکہ اُنہیں

یہ بھی پتہ چل گیا۔ کہ اسلامی ممالک کے سیاسی حالات کیا ہیں اور انہیں اس وقت کن کن مشکلات کا سامنا ہے ٭

افغانستان پہنچتے ہی جمال الدین امیر دوست محمدؐ خاں کے درباری مقرر ہو گئے۔ اور شہزادہ اعظم خان کی تعلیم و تربیت کا کام اُن کے سپرد کر دیا گیا ٭

اس زمانہ میں ہرات پر ایران کا قبضہ تھا اور وہاں کا گورنر امیر دوست محمدؐ خاں کا ہی ایک بھائی تھا ٭

انگریز ہرات پر ایران کا قبضہ پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ امیر دوست محمدؐ خاں نے اُن کی شہ پا کر ہرات پر حملہ کر دیا۔ اور اپنے بھائی سلطان احمد کو شکست دے کر ہرات کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا ٭

سید جمال الدین چاہتے تھے۔ کہ تمام اسلامی ممالک کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا جائے۔ ہرات ایران کے پاس رہتا یا افغانستان کے پاس۔ اُن کے نزدیک ایک ہی بات تھی۔ اُنہوں نے امیر دوست محمدؐ خاں کو اس لڑائی سے روکنا چاہا۔ لیکن اُن کی کچھ پیش نہ گئی۔ آخر کار انگریز کی پالیسی کامیاب رہی۔ اور ہرات افغانستان میں شامل

ہو گیا۔ فتح ہرات کے بعد امیر دوست محمد خاں کا انتقال ہو گیا۔ اُس نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے شیر علی خاں کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس پر بڑے بیٹے غضبناک ہو گئے ان میں لڑائی ہونے ہی والی تھی۔ کہ سیّد جمال الدّین نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اور اپنی خُداداد ذہانت سے کام لے کر ان کو بہت بڑی تباہی سے بچا لیا ؂

جب شیر علی خاں تخت افغانستان پر بیٹھا۔ تو اُس نے بھی اپنے باپ کی طرح سید جمال الدّین کو اپنا مشیر بنایا۔ لیکن وہ ان سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ کیونکہ وہ زیادہ تر اپنے دوسرے وزیروں کے مشوروں پر چلتا تھا۔ وزیر خود غرض تھے۔ اور جمال الدّین جیسے مخلص اور دیانت دار انسان کو دربار شاہی میں دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اُنہوں نے اُن کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ اور اُسے جمال الدّین سے بدظن کر دیا ؂

شیر علی خاں تخت پر تو قابض ہو چکا تھا۔ لیکن اپنے بھائیوں کو اچھّی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھائیوں بھائیوں میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ سید جمال الدّین نے

ان میں صلح صفائی کرانے کی پوری کوشش کی - مگر ناکام رہے آخر مایوس ہو کر انہوں نے افغانستان چھوڑ دیا - اور ہندوستان آ گئے ۔

اُن کے ہندوستان آنے کے بعد شیر علی خاں اور اُن کے بڑے بھائی اعظم خاں میں چل گئی - اعظم خاں نے شیر علی خاں کو شکست دے کر افغانستان پر قبضہ کر لیا۔ شیر علی خاں ہرات بھاگ گیا - اعظم خاں نے تخت پر بیٹھتے ہی جمال الدین کو ہندوستان سے بلا لیا اور اپنا وزیر مقرر کر دیا ۔

(۲)

اُدھر شیر علی بیکار نہیں بیٹھا تھا - اُس نے موقعہ پاتے ہی انگریزوں کی امداد سے اعظم خان پر چڑھائی کر دی اور کھوئے ہوئے تاج و تخت پر دوبارہ قبضہ کر لیا - اسے سید صاحب سے سخت رنجش تھی - لیکن اس نے اُن کے اثر و رسوخ کا خیال کرتے ہوئے کوئی تکلیف پہنچانا مناسب نہ سمجھا اور انہیں حج پر جانے کی اجازت دے دی ۔

جمال الدین پھر ہندوستان آ گئے اور یہیں سے مصر روانہ ہو گئے - مصر پہنچ کر اُنہوں نے جامعہ ازہر کے طلباء

سے اپنے تعلقات بڑھائے (جامعہ ازہر مصر کی ایک ہزار سال کی پرانی یونیورسٹی ہے) طلباء نے جب یہ دیکھا کہ وُہ موجودہ زمانہ کے بہت بڑے عالم ہیں۔ تو وُہ ان کے گرویدہ ہوگئے۔ اور ان کے اشارے پر بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مصر میں اُن کے بڑھتے ہُوئے اثر کو دیکھ کر انگریزوں کو فکر ہُوئی اور اُنہوں نے مصر کی گورنمنٹ پر دباؤ ڈال کر انہیں وہاں سے نکلوا دیا۔

جمال الدین مصر سے ترکی آ گئے۔ اُن دنوں ترکی کی حالت بیحد خراب تھی۔ ملک کا انتظام بگڑا ہُوا تھا۔ اور یورپی ممالک اُسے ختم کرنے پر تُلے ہُوئے تھے۔ اس کے علاوہ ملک میں بہت زیادہ بے چینی پائی جاتی تھی۔ ترکی کو مشکلات سے بچانے کے لئے نوجوانوں کی ایک جماعت "ترکان احرار" کے نام سے میدان میں آچکی تھی جمال الدین نے اس جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کر دیا۔ حکومتِ ترکی سید صاحب کی سیاسی قابلیت سے واقف تھی۔ اور جانتی تھی۔ کہ اگر وہ مدد کریں۔ تو ترکوں کی مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ترکی وزیر اعظم عالی پاشا نے قسطنطنیہ

میں اُن سے ملاقات کی۔ اور اُن سے ایک ایسا پروگرام بنانے کو کہا۔ جس سے ملک کو یورپی طاقتوں کے چنگل سے بچایا جاسکے۔ سیّد جمال الدّین افغانی نے تقریروں کا ایک پروگرام تیار کیا اور جگہ جگہ جلسے کرکے تمام ملک میں ہل چل پیدا کر دی۔ اُن کی تقریریں بہت زیادہ پسند کی گئیں۔ یورپی حکومتیں اُن کی سرگرمیوں سے بے خبر نہیں تھیں۔ وہ ان کے سخت خلاف ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ترکی کے شیخ الاسلام کو ان کی بڑھتی ہوئی شہرت کچھ اچھی نہ لگی۔ اور اس کی پارٹی نے اُن کی مخالفت شروع کر دی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہیں ٹرکی کو خیرباد کہنا پڑا اور ۲۲ مارچ ۱۸۷۱ء کو پھر مصر پہنچ گئے ؎

اِس زمانہ میں اسماعیل پاشا مصر پر حکومت کرتا تھا۔ یہ شخص بہت زیادہ فضول خرچ اور عیاش تھا۔ رعایا کی حالت خراب ہو چکی تھی ؎

اسماعیل پاشا نے سب سے بڑی غلطی یہ کی۔ کہ نہر سویز کے بہت سے حصے انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیئے تھے چونکہ مصر بحیرہ رُوم کی شاہراہ پر واقع ہے۔ اِس لیے

یورپ کے ہر لالچی ملک میں یہ خواہش پیدا ہو چکی تھی کہ وہ مصر پہ پنجہ جمائے۔ جب جمال الدین مصر پہنچے۔ تو مصریوں نے یوں محسوس کیا۔ جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل جاتا ہے وُہ یہ اچھی طرح جانتے تھے۔ کہ سیّد صاحب کی مدد سے غیروں کی غلامی سے نجات پا سکتے ہیں۔ جمال الدین نے پھر جامع ازہر کو اپنا مرکز بنا لیا اور "محفل وطن" کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ دو اخبار "مصر" اور "ابو نظارا" سیّد صاحب کی نگرانی میں نکلنے لگے۔ اور غیر ملکی اثر کو مصر سے نکالنے کی کوششیں زور شور سے شروع ہو گئیں ⁘

سیّد جمال الدّین یہ جانتے تھے۔ کہ جب تک حکومت کی باگ ڈور اسمٰعیل پاشا جیسے فضول خرچ اور عیاش بادشاہ کے ہاتھ میں ہے۔ مصر کو غیر ملکی غلامی سے نجات دلانا ناممکن ہے ⁘

توفیق پاشا۔ اسمٰعیل پاشا کا رشتہ دار اور سیّد صاحب کا ہم خیال تھا۔ اِس لئے سیّد صاحب توفیق پاشا کو مصر کے تخت پہ بٹھانا چاہتے تھے۔ اسمٰعیل پاشا کے خلاف رعایا کے جذبات اِس درجہ بھڑک اُٹھے تھے۔ کہ آخر اسے

تخت چھوڑنا پڑا۔ اور سیّد صاحب کی خواہش سے توفیق پاشا خدیو مصر بن گیا (مصر کے بادشاہوں کو خدیو کہتے ہیں) اس نے سیّد صاحب کی پارٹی کے ایک شخص شریف پاشا کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ لیکن تخت و تاج پر قبضہ کرنے کے بعد توفیق پاشا نے طوطا چشمی اختیار کی اور سیّد صاحب کے پروگرام پر چلنے کے بجائے اُن کا مخالف ہو گیا۔ اصل میں بات یہ تھی۔ کہ صرف بادشاہ بننے کے لئے توفیق پاشا نے سیّد صاحب کی آڑ لے رکھی تھی۔ جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ تو اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا۔ کہ شریف پاشا کو وزارت سے الگ کر دیا۔ اور پھر سیّد صاحب کو بھی مصر سے نکال باہر کیا۔

(۳)

سیّد جمال الدین مصر سے ہندوستان پہنچے اور حیدرآباد دکن میں مقیم ہو گئے۔ اپنے چند دن کے قیام میں اُنھوں نے اُردو کی ترقی پر زور دیا۔ آجکل جو ہم عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کو ذریعہ تعلیم دیکھتے ہیں۔ یہ اصل میں انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

انگریزوں نے ان کا ہندوستان میں ٹھہرنا پسند نہ کیا اور انہیں گرفتار کر کے کلکتہ پہنچا دیا۔ کلکتہ سے لندن اور لندن سے پیرس بھیج دیا گیا۔ سید صاحب کے دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ لیکن اسلامی ممالک کے اتحاد کا جو مقصد وہ لے کر آئے تھے۔ اُسے اُنہوں نے ہاتھ سے نہ دیا۔ اور اس کے لئے برابر کوشش کرتے رہے۔ پیرس میں اُنہوں نے ایک انجمن "عروۃ الوثقیٰ" کے نام سے قائم کی اور اسی نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر وہ خود تھے۔ اور نائب ایڈیٹر اُن کا ایک شاگرد مفتی محمدؐ عبدہٗ ایک پُرجوش مصری نوجوان تھا ۔

اِسی زمانہ کا ذکر ہے۔ کہ مہدی سوڈانی نے سوڈان میں انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کیا اور انگریزوں کا مشہور جرنیل جنرل گارڈن اسی جنگ میں مارا گیا۔ انگریزوں نے جمال الدین کو بیچ میں ڈال کر صلح کرنا چاہی۔ لیکن اُنہوں نے یہ شرط رکھی۔ کہ پہلے برطانیہ سوڈان کو خالی کر دے۔ انگریزوں نے یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے افغانستان۔ ایران اور ترکی کو رُوس کے

خلاف اکٹھا کرنا چاہا۔ لیکن سید جمال الدین نے فوراً مصر کی آزادی کی شرط پیش کر دی۔ انگریز اس شرط کو ماننے سے بھی تامل کرتے رہے۔ جب وہ انگریزوں کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ تو انہوں نے اسلامی ممالک کو روس کے ساتھ شامل کرنا چاہا۔ انہیں اس مقصد میں زیادہ کامیابی تو نہیں ہوئی۔ البتہ مسلمانوں پر آئے دِن روس کے جو مظالم ہوتے رہتے تھے۔ وہ رُک گئے۔ اور رُوس کی حکومت نے اُن پر سے تمام پابندیاں ہٹا لیں ؛

پیرس میں کافی عرصہ تک سید صاحب کا قیام رہا یہاں سے وہ ایران چلے گئے۔ ایرانیوں نے اُن کی بڑی خاطر مدارات کی۔ شاہ ناصر الدین قاچار نے انہیں ملاقات کے لئے بلایا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ایران کے لئے ایسی اسکیم بنا دیں۔ جو ملک کی ترقی کے لئے ضروری ہو ؛

لہٰذا انہوں نے ایرانیوں کی بہتری کے لئے بہت سی تجویزیں پیش کیں۔ لیکن بادشاہ نے اُن کے ماننے سے انکار کر دیا۔ جمال الدین کو بادشاہ کے اس رویہ سے سخت

مایوسی ہوئی اور وہ ایران سے رُوس چلے گئے وہاں انہوں نے پیٹروگراڈ میں زارِ رُوس سے ملاقات کی (رُوس کے بادشاہ کا لقب زارِ رُوس تھا) زارِ رُوس پر اُن کی شخصیت اور بات چیت کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ اُس نے سیّد صاحب کو رُوس کے مسلمانوں کی سرداری پیش کرنا چاہی۔ لیکن جمال الدین نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

جمال الدّین رُوس سے جرمنی چلے گئے اور پھر وہاں سے واپس پیرس پہنچ گئے۔ اُن دنوں شاہ ایران ناصر الدّین قاچار پیرس میں موجود تھا اور اپنے ملک کی دولت کو عیاشیوں میں برباد کر رہا تھا۔ اتّفاق سے اس کی ملاقات سیّد صاحب سے ہو گئی۔ اور اس نے سید صاحب کو دوبارہ ایران آنے کی دعوت دی۔ چونکہ جمال الدین ایک مرتبہ اس کی ڈھل مل یقینی سے مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن پھر بھی ایران کی حالت سُدھارنے کے لئے آخری کوشش کرنے کی ٹھان لی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ ایران پہنچ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے دیکھا کہ ملک کی حالت نہایت بدتر ہو چکی ہے اور ناصر الدین قاچار ملک اور قوم کی دولت کو یورپ میں برباد کر رہا ہے۔ یورپ

والوں نے ایران میں لوٹ کھسوٹ مچا رکھی تھی ۔ بادشاہ نے تجارت اور معدنیات (سونے چاندی کی کان) کا ٹھیکہ یورپ کے ساہوکاروں کو دے رکھا تھا ؂

جمال الدین نے ایران پہنچتے ہی بادشاہ کو اپنی آمد سے اطلاع دی ۔ لیکن اُس نے اُنہیں ملاقات کے لئے نہ بلایا ۔ اِس کے بعد اُنہوں نے بادشاہ کو ایک خط لکھا ۔ جس کے جواب میں بادشاہ نے اُن کی آمد پر خوشی کا اظہار تو کیا لیکن ملاقات کے سوال کو بڑی خوب صورتی سے ٹال گیا ؂

(۴)

ایران کے وزیر اعظم کو جمال الدین کا ایران آنا کچھ اچھا نہ لگا اور انہیں ملک سے نکالنے کی فکر میں رہنے لگا ۔ جمال الدین یہ جانتے تھے کہ وزیر اعظم کو تمام اختیارات حاصل ہیں ۔ اگر وہ چاہے تو ملک کو تباہی اور بربادی سے بچا سکتا ہے ۔ آخر اُنہوں نے وزیر اعظم کے خلاف تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا ۔ وزیر اعظم نے اس کا بدلہ یوں لیا ۔ کہ شدید بیماری کی حالت میں شاہ عبد العظیم کی خانقاہ سے گرفتار کرا لیا ۔ اور طرح طرح کی تکلیفیں دے کر انہیں بصرہ بھجوا

دیا ؂

سید جمال الدین کو جب آرام آگیا۔ تو بصرہ سے لندن پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے ایک اخبار جاری کیا جس میں اُنہوں نے شاہ ایران اور اس کی حکومت پر شدید نکتہ چینی کی۔ اِس اخبار نے ایران میں ایک کھلبلی مچا دی۔ حکومت ایران نے اِس پرچہ کو بند کرانے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ناصر الدین قاچار ۶ مئی ۱۸۹۶ء کو قتل کر دیا گیا ؂

جمال الدین کچھ مدت تک لندن رہے۔ اور پھر یہاں سے سلطان ترکی کی دعوت پر دوبارہ ترکی چلے گئے۔ وہاں ان کا شاہانہ استقبال ہوا۔ سلطان یہ جانتا تھا کہ سیّد صاحب اسلامی دنیا کے اِتحاد کے حامی ہیں۔ اِس لئے وہ ان کی مدد سے تمام اسلامی دنیا کا خلیفہ بننا چاہتا تھا۔ لیکن جمال الدین پر بھی یہ ظاہر تھا کہ سلطان میں خلیفہ بننے کی کوئی خوبی موجود نہیں ہے ؂

(۵)

سلطان کو یہی غلط فہمی رہی۔ کہ سید صاحب اس کو اچھّا

سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے انہیں خوش کرنے کے لئے ایک تمغہ
دینا چاہا۔ جو عام طور پر امیروں وزیروں کو دیا جاتا تھا۔
جب شاہی ایلچی تمغہ لے کر اُن کے مکان پر پہنچا۔ تو وہ
طالب علموں کو پڑھا رہے تھے۔ اُنہوں نے ایلچی سے تمغہ
لے کر ایک بلّی کے گلے میں ڈال دیا اور بولے "تمغہ
بے ایمان پہنتے ہیں" شاہی ایلچی یہ دیکھ کر سکتہ میں رہ
گیا۔ اُس نے واپس جا کر ساری بات سلطان سے کہہ دی۔
سلطان کو غصّہ تو بہت آیا۔ لیکن جمال الدین کی بزرگی کا
خیال کر کے چپکا ہو رہا۔ اس کے بعد ایک اور ایسا ہی
واقعہ ہوا۔ جس سے سلطان ان سے اور زیادہ چڑھ گیا۔
ہوا یوں کہ سلطان کے بیٹے اور مسجد نبویؐ کے خادم سید
عبداللہ میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ شہزادہ کے کہنے سے پولس
نے سید عبداللہ کو گرفتار کرنا چاہا۔ لیکن جمال الدین نے
انہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ اور پولس کے حوالہ کرنے
سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اُنہوں نے سید عبداللہ
کو خدیو مصر عباس حلمی پاشا کے سپرد کر دیا۔ جو اِن دنوں
ترکی آیا ہوا تھا۔ وہ سید عبداللہ کو لے کر مصر چلا گیا۔

اور سیّد عبداللہ اِس طرح سلطان ترکی کے شاہی عتاب سے بچ گئے ؂

جمال الدین سُلطان سے یوں بھی بدظن تھے ۔ کہ وہ اپنے ایک وزیر ابوالہدیٰ نامی پر بہت بھروسہ کرتا تھا اور اس کے غلط مشوروں پر چلتا تھا ۔ جمال الدین ابولہدیٰ کو شیطان کہہ کر پکارا کرتے تھے ۔ اُن کی صاف گوئی اور بے باکی نے سلطان اور ابوالہدیٰ کو ان کا دشمن بنا دیا تھا اِس دشمنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں ترکی میں نظر بند کر دیا گیا ۔ اِس نظر بندی کے دوران میں ہی ان کو سرطان کی بیماری نے آدبایا ۔ سیّد صاحب نے عِلاج کے لیئے واپس جانا چاہا لیکن سلطان نے اجازت نہ دی ۔ آخر ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو اس جلیل القدر انسان نے ساٹھ برس کی عمر میں انتقال کیا ۔ انتقال کے وقت اُن کے ہاتھ میں تسبیح اور گود میں کتاب تھی ؂

وفات کے بعد سید جمال الدین مرحوم کو قسطنطنیہ میں دفن کر دیا گیا ۔ اُن کی قبر بہت مدت تک کچی رہی ۔ آخر ایک امریکن نے اپنے خرچ سے اُن کی قبر ۱۹۱۹ء میں پختہ

کرادی ؎

دنیائے اسلام کا یہ مردِ مجاہد چالیس بیالیس برس تک ترکی کی سرزمین میں مدفون رہا۔ آخر ایک مدت کے بعد افغان قوم کی رگِ حمیت پھڑکی اور اس نے افغانستان کے اِس فرزند کو مرنے کے بعد یوں غریب الوطن رکھنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ ان کی لاش کو افغانستان میں لاکر بڑی عزّت و احترام کے ساتھ دفن کر دیا گیا ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سر سیّد احمدؐ خاں

(۱)

۱۸۵۷ء سے قبل کا زمانہ مسلمانوں کے لئے بہت زیادہ مصیبت کا تھا۔ سوداگروں کے بھیس میں آئے ہوئے انگریزوں نے قریب قریب تمام ہندوستان پر قبضہ کر لیا تھا۔ خاندانِ مغلیہ کے آخری حکمران ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ابھی تک لال قلعہ میں رہتے تھے۔ لیکن اُن کی حیثیت صرف ایک وظیفہ خوار کی تھی۔ ملک کے انتظام سے انہیں کوئی واسطہ نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ قلعہ میں اُن کی حکومت تھی اور قلعہ کی سُرخ دیواروں کے باہر انگریزوں کا راج تھا۔

اسی سال کے ضعیف و ناتواں بادشاہ کو یہ معلوم تھا کہ اب وہ شطرنج کے بادشاہ سے زیادہ حیثیّت نہیں رکھتا۔

لیکن محض وضع داری نبھانے کے لئے اس نے چند وزیر اور کچھ درباری رکھ چھوڑے تھے - اِن درباریوں میں ایک شخص سیّد میر تقی بھی تھا - جس پر عالم اور فاضل ہونے کی وجہ سے بادشاہ بہت زیادہ مہربان تھا - دہلی میں میر تقی کا گھرانہ بڑا معزز اور شریف مانا جاتا تھا ؎

اِس میر تقی کے ہاں ۱۸۱۷ء میں ایک بچّہ پیدا ہؤا جس کا نام سید احمد خاں رکھا گیا - یہ بچّہ بچپن ہی سے بہت زیادہ ذہین اور ہونہار تھا - چھوٹی سی عمر میں اس نے قرآن مجید پڑھ لیا اور پھر اُس کے والد نے اُسے ایک مکتب میں داخل کرا دیا - جہاں اس نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی - اٹھارہ بیس برس کی عمر میں وہ تعلیم سے فارغ ہو گیا ؎

سید احمد خاں کی عمر ابھی بائیس برس ہی کی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور سارے کنبہ کے خرچ کا بوجھ ان کے کندھوں پر آن پڑا - ان کے والد نے اِتنی جائداد نہیں چھوڑی تھی - جس سے اُن کے انتقال کے بعد بھی گھر کا خرچ چلتا رہتا - آخر اُنھوں نے ایک معمولی ملازمت کر لی اور

دہلی کی کچہری میں کام کرنے لگے۔ کچھ مدت تک دہلی میں کام کرنے کے بعد اُن کا تبادلہ آگرہ کمشنری میں ہو گیا اور وہاں انہیں نائب منشی کی جگہ پہ ترقی مل گئی۔ آگرہ ہی میں اُنہوں قانون پڑھا اور منصفی کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد وہ وہیں منصف مقرر ہو گئے۔ کوئی پانچ سال کے بعد گورنمنٹ نے انہیں ترقی دے کر دہلی تبدیل کر دیا اور وہ منصف اعلیٰ کے عہدے پہ کام کرنے لگے۔ مغلیہ سلطنت کا آخری تاجدار بہادر شاہ نے بھی اُن کی حسن خدمت سے خوش ہو کر دبیرالدولہ کا خطاب عطا کیا تھا۔

(۲)

سید احمد خاں اپنی والدہ کے بڑے فرمانبردار تھے! انہوں نے ایک سو روپے ماہانہ سے آٹھ سو روپے ماہانہ تک تنخواہ پائی۔ لیکن وہ ساری کی ساری تنخواہ اپنی والدہ کے ہاتھ میں دے دیتے تھے۔ والدہ صرف پانچ روپے اُن کے ذاتی خرچ کیلئے لوٹا دیتیں۔ اور باقی روپے سے گھر کا خرچ چلاتیں۔ جیسے بھی کپڑے وہ سید احمد خاں کو پہننے کے لئے دیتیں۔ وہ پہن لیتے اور جو کچھ کھانے کے لئے دیتیں۔ وہ کھا لیتے۔

ماں کی حکم عدولی کرنے کی اُن میں ہمت نہیں تھی۔ جو کچھ کہتیں وہ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کہ ان کی ماں بھی تمام ماؤں کی طرح نہیں تھی۔ بلکہ وہ ایک پڑھی لکھی اور روشن خیال خاتون تھیں۔ انہوں نے سید احمد خاں کی تربیت اور پرورش ایسے اچھے ڈھنگ سے کی تھی۔ کہ بہت کم عورتوں کو اس کا سلیقہ ہوگا۔ اُنہوں نے بچپن ہی میں یہ بات سید احمد خاں کے ذہن نشین کرا دی تھی۔ کہ خدا ترسی حُب الوطنی اور غریب پروری ہی ایک انسان کے اوصاف ہیں۔ اگر کسی انسان میں یہ صفتیں نہ ہوں تو وہ انسان کہلانے کا حقدار نہیں ۔

سید احمد خاں ابھی بچہ ہی تھے۔ کہ گھر کے ایک ملازم سے کسی بات پر ناراض ہوگئے۔ اور غصہ کی حالت میں اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ ماں کو معلوم ہوا۔ تو انہوں نے سید احمد خاں کو گھر سے نکال دیا۔ وہ اپنی خالہ کے ہاں پہنچ گئے۔ جو دہلی میں رہتی تھیں۔ خالہ اپنے بھانجے کو لے کر اپنی بہن کے پاس آئی اور بولی۔ اب آپ احمد کو

معاف کر دیجئے۔ آئندہ وہ ایسی حرکت نہیں کرے گا"۔
ماں نے کہا۔ "اگر یہ نوکر سے معافی مانگ لے اور نوکر اسے
معاف کر دے۔ تو یہ میرے گھر میں رہ سکتا ہے ورنہ نہیں"۔
آخر سید احمد خاں کو اس نوکر سے معافی مانگنا پڑی اور
آئندہ یہ وعدہ کیا کہ میں کسی نوکر سے کبھی جھگڑا نہیں کرونگا
سید احمد ہمیشہ اپنے وعدہ پر قائم رہے اور انہوں
نے کسی ملازم کو پھر کبھی نہیں ستایا۔ بلکہ ہمیشہ اُن کی خطاؤں
سے دَرگذر کرتے۔ اور ان سے بڑی اچھی طرح سے پیش
آتے ۔

کچھ عرصے بعد اُن کا تبادلہ بجنور میں ہو گیا۔ بجنور میں
کام کرتے انہیں کوئی چار برس ہوئے تھے۔ کہ غدر یعنی
جنگِ آزادی شروع ہو گئی اور ہندوستانی فوجوں نے
انگریزوں کے خلاف کئی جگہ بغاوت کر دی۔ انگریزوں نے
اپنی حکومت میں ہندوستانیوں پر جو ناروا سختیاں کی تھیں۔
اور جس مکّاری اور فریب سے ملک کے ہر حصّہ پر قبضہ
کیا تھا۔ یہ بغاوت اسی کا ردِ عمل تھی۔ سید احمد خاں انگریزوں
کے ظلم و تشدّد سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ اور ملک میں

بدیشی حکومت نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے۔ کہ ابھی ہندوستانیوں میں انگریزی حکومت کا تختہ الٹنے کی طاقت نہیں اور ہندوستانیوں نے اپنی طاقت کا اندازہ کئے بغیر یہ بغاوت کی ہے۔ اس کا نتیجہ خود ہندوستانیوں کے حق میں نقصان دہ ہوگا۔

(۱۴)

جس زمانہ میں جنگ آزادی شروع ہوئی۔ اس وقت کوئی ۲۰ انگریز مرد۔ عورتیں اور بچے بجنور میں تھے۔ یہ لوگ بہت زیادہ پریشان تھے۔ لیکن سید احمد نے اُن کی ہمّت بندھائی اور کہا۔ جب تک میں زندہ ہوں۔ کوئی آپ کا بال تک بیکا نہیں کر سکے گا۔ یہ حوصلہ افزا الفاظ سُن کر انگریز مطمئن ہو گئے۔ لیکن اسی اثنار میں کسی نے باغیوں کو اطلاع دے دی کہ ۲۰ انگریز سید احمد خاں کے مکان میں موجود ہیں۔ یہ سنتے ہی ایک ہندوستانی فوجی دستہ نے سید احمد خاں کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ انگریزوں کی مارے خوف کے بُری حالت ہو گئی۔ یہ دیکھ کر سید احمد مکان سے باہر نکلے اور باغیوں سے کہا۔

کہ نہتے مرد۔ عورتوں اور بچّوں کو چاہے وہ کسی قوم سے ہوں، قتل کرنا کوئی مردانگی نہیں ہے۔ اگر آپ کو کوئی تکلیف ہے تو وہ انگریزی حکومت سے ہے۔ اس کا بدلہ بے گناہوں سے لینا ٹھیک نہیں۔ ان عورتوں اور بچّوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ اگر آپ نے ان کو قتل کر دیا۔ تو یاد رکھئے۔ ہندوستان کی نیک نامی پر ایک ایسا دھبّہ آجائے گا۔ جو کبھی دُور نہیں ہو سکے گا۔ اور دُنیا نہ صرف ہندوستان کو ظالم اور سفّاک کہے گی۔ بلکہ انگریزوں کی یہ بات سچ ثابت ہو جائے گی کہ ہندوستانی حکومت کرنے کے اہل نہیں۔ اس کا نتیجہ ایک ایسی غلامی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ کہ آنے والی نسلیں آپ کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں کریں گی"

سید احمد خاں کی تقریر نے باغیوں کے دِل پر اثر کیا اور وہ انگریزوں کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر وہاں سے چلے گئے۔ باغیوں کے چلے جانے کے بعد سر سیّد نے انگریزوں کو اپنی حفاظت میں رکھنا مناسب نہ سمجھا اور انہیں رات کی رات انگریزی چھاؤنی میں پہنچا دیا۔ اس جنگ کے دوران سر سید احمد خاں نے انگریزوں کی جو امداد کی تھی۔ اس خدمت کے

صلہ میں انہیں ایک ہزار روپے کی خلعت ملی اور دو سو روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر ہو گیا۔ گورنمنٹ نے ایک رئیس کی جائداد بھی انہیں دینا چاہی۔ لیکن انہوں نے یہ کہتے ہوئے لینے سے انکار کر دیا۔ کہ میں ایک ہندوستانی بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانا نہیں چاہتا ؛

جنگ آزادی میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر حصہ لیا تھا۔ لیکن انگریزی حکومت نے صرف مسلمانوں کو ہی مجرم گردانا اور انہیں کچلنے کی کوشش شروع کر دی۔ سر سید احمد خاں نے اُس زمانہ میں انگریزوں کی جو خدمات کی تھیں۔ انہیں ان کا اعتراف تھا۔ اور وہ ان کی عزّت کرتے تھے۔ سید احمد خاں نے اس سے فائدہ اُٹھایا اور انگریزی حکومت پر اثر ڈال کر اپنی قوم کو اس کے عتاب سے بچایا۔ اگر سر سید احمد خاں کی کوششیں آڑے نہ آتیں۔ تو نہ جانے مسلمانوں پر کیا بیت چکی ہوتی۔ سید احمد خاں نے مسلمانوں کی صفائی پیش کرنے کے لئے دو کتابیں لکھیں :

(۱) اسباب بغاوت ہند" (۲) "وفادار ہندوستانی

ایک کتاب میں وہ لکھتے ہیں :-

"ہر ایسی آفت جو رام دین اور گنگا دین کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے لئے مسلمان کو مجرم گردانا جاتا ہے۔ ہندوستان پر کوئی ایسی بلا نازل نہیں ہوئی۔ جس نے مسلمان کا گھر نہ تاکا ہو۔ میں نے انگریزی اخبارات پڑھے ہیں۔ ہر ایک نے یہی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کہ دنیا میں مفسد اور بدذات اگر کوئی ہے۔ تو وہ صرف مسلمان ہے" ۔

سید احمد خاں نے اپنی کتابوں میں یہ ثابت کر دیا۔ کہ جنگِ آزادی کی ذمہ داری تنہا ہندوستان کے مسلمانوں پر نہیں ہے۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں طور پر حصہ لیا ہے۔ صرف مسلمانوں کو مجرم گرداننا ٹھیک نہیں۔ سید احمد خاں کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ انگریز نے مسلمانوں پر وحشیانہ مظالم کا سلسلہ بند کر دیا۔

(۴)

اس زمانہ میں جبکہ انگریزی اخبارات بغاوت کا سارا الزام مسلمانوں پر منصوب رہے تھے۔ ایک انگریز ڈاکٹر ہنٹر نامی نے ایک کتاب لکھی۔ جس میں اس نے یہ ثابت کرنے

کی کوشش کی - کہ مسلمان ہمیشہ عیسائیوں کے دشمن رہے ہیں
سید احمد خاں نے اس کتاب کے جواب میں ایک سلسلہ مضامین
لکھا - جس میں اُس انگریز کا منہ توڑ جواب دیا گیا تھا - یہ سلسلہ
مضامین ایک کتابی شکل میں شائع ہوا - اور انگلستان میں تقسیم
کیا گیا - انگلستان میں مسلمانوں کے خلاف جو زہریلی فضا پیدا
کی گئی تھی - اس طرح سے دُور کر دی گئی ۔

جب ملک میں امن وامان قائم ہو گیا - تو سید احمد خاں
کی تبدیلی بجنور سے مراد آباد ہو گئی - اس ضلع میں زبردست
قحط پڑا ہوا تھا اور سینکڑوں انسان بھوکے مر رہے تھے -
سید احمد خاں نے اپنے عہدے کا چارج لیتے ہی قحط کی
روک تھام کی طرف توجہ کی - اور سرکاری خرچ سے ایک
محتاج خانہ قائم کیا - اس محتاج خانہ میں چودہ ہزار آدمیوں
کو مفت کھانا دیا جاتا تھا - اس کا انتظام اتنا اچھا تھا - کہ
ایک گھنٹہ کے اندر اندر سب کو کھانا تقسیم کر دیا جاتا تھا -
سید احمد خاں اپنے خرچ سے ہر روز ایک دیگ سالن
کی تیار کرواتے اور روٹیوں سمیت اپنے ہاتھ سے محتاجوں
میں تقسیم کرتے ۔

مراد آباد میں ایسے شریف گھرانے بھی تھے۔ جو قحط کا شکار ہو چکے تھے۔ لیکن محتاج خانہ میں جا کر کھانا کھانا اپنی شہرت اور عزّت کے خلاف سمجھتے تھے۔ سر سید احمد خاں ایسے گھرانوں میں خود کھانا بھجوا دیتے تھے۔ جو لوگ کھانا لینے سے انکار کرتے۔ اُن کے سپرد کچھ کام کر دیتے۔ تاکہ انہیں یہ خیال رہے کہ کھانا خیرات کے طور پر نہیں۔ بلکہ ان کی محنت کے معاوضہ میں مِل رہا ہے۔ اِس محتاج خانہ میں ہندو بھی تھے اور مُسلمان بھی۔ دونوں کے کھانے الگ الگ پکتے تھے۔ تاکہ کسی کو اعتراض نہ ہو۔ محتاج خانہ کے ساتھ ہی اُنہوں نے ایک شفاخانہ قائم کروا دیا تھا۔ جہاں تنگ دست اور غریب آدمیوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا ؛

انہی ملازمت کے دوران میں سید احمد خاں سیر کے لئے انگلستان بھی گئے۔ وہاں کی درسگاہوں کے انتظام اور تعلیم کے ڈھنگ کو دیکھ کر بڑے متاثر ہوئے۔ اور اُنہوں نے دِل ہی دِل میں یہ عہد کر لیا کہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے لِئے ایک ایسی ہی درسگاہ بنواؤں گا"

جب وہ ہندوستان واپس آئے۔ تو درسگاہ قائم کرنے کا خیال اُن کے دِل میں موجود تھا۔ بجنور سے ان کی تبدیلی علی گڑھ ہو گئی۔ یہاں پہنچتے ہی اُنھوں نے درسگاہ کے قیام کی کوشش شروع کر دی۔ اور اس مقصد کے لیئے ایک انجمن قائم کی۔ جن کی نگرانی میں کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام شروع ہو گیا۔ اِس انجمن کا تمام خرچ وُہ اپنی گرہ سے ادا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بیگم بھوپال نے ان کی اسلامی خدمات کے صلہ میں اپنی ایک انگوٹھی دی جس کی مالیت ایک ہزار روپیہ تھی۔ یہ انگوٹھی اُنھوں نے اِس انجمن میں دے دی ؛

(۵)

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں پر خوفناک اور وحشیانہ ظلم کئے تھے اُنکی وجہ سے مسلمان انگریزوں سے بیحد نفرت کرتے تھے۔ انہیں انگریزی تمدن اور زبان تک سے نفرت ہو چکی تھی۔ لیکن سر سیّد یہ جانتے تھے۔ کہ اگر مسلمانوں کی نفرت کا یہی عالم رہا۔ تو دوسری ہندوستانی اقوام پڑھ لکھ کر آگے نکل جائیں گی۔ اور مسلمان تعلیمی لحاظ

سے اچھوت بن کر رہ جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اُن کی تعلیم کے لئے مغربی طرز کی ایک درسگاہ قائم کرنا چاہتے تھے اُنھوں نے مسلمانوں میں انگریزی وغیرہ کا شوق پیدا کرنے کے لئے ایک اخبار بھی جاری کیا۔ ان کی اس تحریک کا فوری اثر یہ ہوا۔ کہ مسلمانوں نے ان پر شدید نکتہ چینی کی اور ان کی تحریک کی مخالفت کی۔ علمائے دین نے اُن کی اس تحریک کو اسلام کے خلاف قرار دیا اور اُن پر کفر کے فتوے لگا دیئے۔ لیکن اس خدا کے برگزیدہ بندے کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ اور وہ برابر اپنے کام میں مصروف رہا ؂

سید احمد خاں نے اپنی تعلیمی سکیم کو پورا کرنے کے لئے ملک میں دورے کئے۔ اور مسلمانوں میں علمی شوق پیدا کرنے کے لئے جگہ جگہ تقریریں۔ اُنھوں نے اِس طرح سے اپنی درسگاہ کے لئے لاکھوں روپے جمع کر لئے۔ جب وہ اِس سلسلہ میں کسی جگہ جاتے۔ تو ان کے دوست احباب اور عقیدت مند انہیں دعوتیں دیتے۔ مگر وہ یہ کہہ کر اُن کی دعوتوں کو نامنظور کر دیتے۔ کہ جو قیم آپ میری

دعوت پر خرچ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کالج کے فنڈ میں دے دیجئے۔ آخر ان کی کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ اور ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ایک درسگاہ مدرستہ العلوم کے نام سے قائم ہوگئی۔ اور دو سال کے بعد ۱۸۷۷ء میں محمڈن اورینٹل کالج علی گڑھ مدرستہ العلوم کی بنیادوں پر قائم ہو چکا تھا۔ لیکن مخالفین اُسے بند کرانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔

سید احمد خان ان تمام مخالفتوں کے باوجود اپنے کام میں لگے رہے۔ خدا نے اُن کی نیک نیتی اور خلوص کے صلہ میں اُن کے ہر کام میں برکت عطا فرمائی۔ جو پودا کالج کی شکل میں لگا گئے تھے۔ وہ ۱۹۲۰ء میں ایک تناور درخت بن گیا۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی سے وہ اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے تمام دنیا میں مشہور ہے۔

سر سید احمد خاں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں سرکاری ملازمت چھوڑ دی۔ اور تمام وقت کالج کی فلاح اور بہبودی کے لئے خرچ کرنے لگے۔ وہ بوڑھے ہو

چکے تھے۔ لیکن نوجوانوں کی سعی ہمت اور حوصلہ کے ساتھ
یہ کام کرتے رہے ؎

اسی زمانہ میں ہندوستان میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی
کی بنیاد پڑی۔ سید احمد خاں نے اس کے خلاف آواز
اُٹھاتے ہوئے کہا۔ کہ "میں ہندو مسلم اتحاد کا دشمن
نہیں۔ بلکہ حامی ہوں۔ ہاں یہ ہرگز نہیں چاہتا۔ کہ
انگریزوں کی نگرانی میں ہندو راج قائم ہو جائے۔ اور
اس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔ اُس وقت کانگریس
کے صدر ایک مسلمان مسٹر بدرالدین طیب جی تھے انہوں
نے سید احمد خاں کو کانگریس میں شامل ہونے کی دعوت دی۔
لیکن انہوں نے اس دعوت کو نامنظور کر دیا ؎

سید احمد خاں کی عمر اب ۸۲ برس کی ہو چکی تھی ضعیفی
کے عالم میں اُنہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی اور سیاسی اصلاح
کے لئے جو کوششیں کیں۔ اُنہوں نے ان کی صحت پر
بُرا اثر ڈالا۔ اور وہ بعارضہ بخار بیمار ہو گئے۔ آخر
چھ سات دن کی بیماری کے بعد مارچ ۱۸۹۸ء کو ہندوستانی
مسلمانوں کا یہ محسن اعظم رہتی دنیا تک اپنا نام روشن

کر کے سفر آخرت اختیار کر گیا۔

خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شیخ الہند

(۱)

سرسید احمد خاں کے بعد ایک ایسا شخص جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادی کا سبق دیا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن تھے ۔ وہ سیاست کے ماہر اور ایک زبردست عالمِ دین تھے ۔ سرسید احمد خاں کا کام تو صرف ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم تک محدود رہا۔ لیکن مولانا محمود الحسن کی گہری نظروں نے ساری اسلامی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اُنہوں نے اسلامی دنیا کی نہ صرف حصولِ آزادی میں رہنمائی کی۔ بلکہ دینی علوم کی دولت سے بھی نوازا ۔ اُن کے علم و بزرگی کا یہ عالم تھا۔ کہ مکّہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ کے بڑے بڑے عالم بھی اُن

کے شاگردوں کے زُمرہ میں داخل ہونا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دارالعلوم دیوبند کے پرنسپل تھے۔ وہ ان مولویوں کی طرح نہ تھے۔ جو محض رٹی ہوئی باتیں طلباء کو پڑھاتے ہیں۔

اُنہوں نے اسلامی علوم کے علاوہ دیگر علوم کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ طلباء کو دینیات بھی پڑھاتے اور دُنیا کی باتیں بھی بتلاتے تھے۔ جن طلباء کو ان سے پڑھنے کا موقعہ ملا۔ اُن میں سے اکثر عالمگیر شہرت کے مالک بنے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم آپ کے نامور شاگرد ہیں۔

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگِ عظیم سے قبل کا زمانہ دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک ادبار اور مصیبت کا وقت تھا۔ یورپ کی طاقتوں نے مسلمانوں کو مٹانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ایک طرف بلقان میں ترکوں کے خلاف جنگ جاری تھی تو دوسری طرف طرابلس کے مسلمانوں کو ختم کیا جا رہا تھا۔ حضرت شیخ الہند کو ممالک اسلامیہ کے علاوہ ہندستان کے مسلمانوں کی فکر بہت زیادہ تھی۔ کیونکہ وہ انگریزوں

کی غلامی میں رہ کر پسے جا رہے تھے - ایسے حالات میں آپ ضلع سہارنپور کی ایک چھوٹی سی بستی دیوبند میں بیٹھے ہوئے چوکھٹے چراغ کی طرح دُنیا کے حالات دیکھ رہے تھے - اور ان کا دماغ ایک خفیہ اسکیم کی تیاری میں مصروف تھا - حکومت برطانیہ بھی ان کی سرگرمیوں سے غافل نہیں تھی - لیکن حکومت کے عتاب کا ڈر ان کو سچی اور بے لاگ بات کہنے سے کبھی نہ روک سکا ؞

(۲)

جب پہلی عالمگیر جنگ چھڑی - تو ترکی نے برطانیہ کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا - ہندوستان کے مسلمانوں کا ترکوں سے ہمدردی کرنا ایک اسلامی جذبہ تھا - لیکن انگریز اس کوشش میں تھے - کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو گمراہ کر کے ترکوں کے خلاف کیا جائے ؞

چنانچہ یہ چال بڑے زور شور سے چلی گئی اور انگریزوں نے چند تنخواہ دار مولویوں سے ترکوں کے خلاف فتوے حاصل کئے - اِس طرح مسلمانوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی گئی - اگر کسی نے اس کے خلاف آواز اُٹھائی - تو اسے

پکڑ کر جیل میں بند کر دیا۔ حکومت کے ایسے سخت روّیہ سے مولانا محمود الحسن کی گرفتاری کا بھی اندیشہ ہو گیا۔ ان کے عقیدت مندوں اور شاگردوں نے انہیں یہی مشورہ دیا۔ کہ وہ حج کے بہانے مکّہ چلے جائیں۔ مولانا یوں چھُپ چھپا کر ہندوستان سے جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن عقیدت مندوں نے عرض کیا۔ کہ اس نازک وقت میں آپ کا جیل سے باہر رہنا نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام عالم اسلام کے لیئے ضروری ہے۔ اگر آپ گرفتار ہو کر قید ہو گئے۔ تو قوم آپ کے قیمتی مشوروں سے محروم ہو جائیگی۔ اور اسے زبردست نقصان پہنچے گا۔ شیخ الہند نے حالات پر ٹھنڈے دِل سے غور کیا۔ اور اس فیصلہ پر پہنچے کہ انہیں ہندوستان سے نکل ہی جانا چاہیئے۔ یہ سوچتے ہوئے اُنہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے عزیز شاگرد مولٰنا عبید اللّٰہ سندھی مرحوم کو ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم سے بات چیت کرنے دہلی بھیجا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ان دنوں خلافت کمیٹی کے ممبر اور مسلمانوں کے بہت بڑے لیڈر تھے۔ مولانا سندھی ڈاکٹر انصاری سے کل معاملات طے کر کے دیو بند

واپس آ گئے ۔ تو شیخ الہند نے اُن کو خفیہ طریقہ سے افغانستان روانہ کر دیا ۔ مولانا سندھی نے کابل پہنچ کر شیخ الہند کی ہدایت کے مطابق افغانستان کے حکمران امیر حبیب اللہ خاں کو اپنی آمد کی اطلاع دی اور ان کے مشورہ سے دوسرے اسلامی ملکوں سے تعلقات قائم کر لئے ۔

(۳)

چونکہ ایک مرتبہ افغانی بھی انگریزوں کی غلامی کا مزا چکھ چکے تھے ۔ لہذا افغانستان کے لوگ بھی مولانا سندھی کی امداد کرتے رہے اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی تدبیریں ہونے لگیں ۔

وہ زمانہ حج کا تھا ۔ مولانا اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بمبئی پہنچے اور وہاں سے "جہاز اکبر" پر سوار ہو کر حجاز روانہ ہو گئے ۔ اُن کی گرفتاری کے احکام جاری ہو چکے تھے ۔ لیکن وہ پولس کے ہاتھ نہ آ سکے ۔ جدّہ کی بندرگاہ پر جہاز سے اُتر کر مکّہ روانہ ہو گئے ۔ وہاں اُنہوں نے حج کیا اور پھر مدینہ منوّرہ پہنچے ۔ جہاں ان کا شاندار استقبال ہوُا ۔ مدینہ کے طلباء کی درخواست پر وہاں اُنہوں نے حدیث کا درس

دینا شروع کر دیا۔

مدینہ منورہ کے قیام کے دوران میں ترکی کے وزیر جنگ غازی انور پاشا اور جمال پاشا روضۂ پاک کی زیارت کے لئے وہاں آئے۔ اہل مدینہ نے ان کا بھی شاندار استقبال کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے روضۂ اقدس کی زیارت سے فارغ ہوئے۔ تو دونوں ترک لیڈروں نے مولانا سے ملاقات کرنی چاہی۔ انھوں نے مولانا محمود الحسن اور اُن کے ساتھیوں کو ملاقات کی دعوت دی۔ جس پر مولانا اپنے ساتھیوں سمیت ترکی وزیر جنگ سے ملے۔ کوئی آدھ گھنٹہ بات چیت کے بعد یہ محفل برخاست ہوگئی۔ اس کے بعد انور پاشا اور جمال پاشا مدینہ منوّرہ سے قسطنطنیہ روانہ ہوگئے۔ مخبروں نے حکومت برطانیہ کو یہ اطلاع پہنچائی۔ کہ مولانا محمود الحسن نے غازی انور پاشا سے کافی دیر تک بات چیت کی۔ اور انگریزی حکومت کے خلاف مسلمان بادشاہوں کے نام ان سے خطوط حاصل کئے۔

شیخ الہند حکومت ترکی سے فوجی مدد لے کر ہندوستان

کو آزاد کرانے کی فکر میں تھے۔ چنانچہ اپنی اِسی اسکیم کے ماتحت مولانا سندھی کو دوسرے مسلمان بادشاہوں سے نامہ پیام کے لئے کابل بھیجا۔ اور آپ نے غالب پاشا سے جو اُن دنوں حکومت ترکی کے وزیر اعظم تھے۔ ملاقات کی اور ان سے امداد کے لئے کہا۔

وہ زمانہ ترکی حکومت کے لئے بہت نازک تھا۔ اکثر مورچوں پر ترکی فوجوں کو نقصان کے ساتھ پیچھے ہٹنا پڑا۔ رُوس جیسی زبردست حکومت بھی ترکی کے خلاف تھی اور روسی فوجیں ترکی علاقہ میں بڑھتی چلی آتی تھیں۔ مختصر یہ کہ حکومت ترکی سخت مشکلات میں گھری ہوئی تھی۔ غالب پاشا وزیر اعظم نے مولانا کو جواب دیا کہ ان دنوں ترکی کی حالت خراب ہے۔ ہماری فوجیں چاروں طرف دشمن کا مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں اور پھر مسلسل جنگوں نے ترکی کی طاقت کو کمزور کر دیا ہے۔ اِس وقت ہندوستان کی آزادی کے لئے فوجی امداد کرنا ممکن نہیں۔ البتہ یہ ایسا وقت ہے۔ کہ اگر ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کا ساتھ نہ دیں اور ہندوستان

ہیں بغاوت کرنے کی کوشش کریں تو اس سے نہ صرف حکومتِ ترکی کو مدد ملے گی۔ بلکہ ہندوستان کی آزادی کی منزل بھی قریب آجائے گی۔ چنانچہ مولانا نے غالب پاشا کی اس معقول بات کو مان لیا اور اپنی توجہ کا رُخ ہندوستان کی طرف پھیر دیا ٭

(۴)

اس وقت ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ خلافت کی تحریک زوروں پر تھی۔ مسلمانوں نے انگریزوں کو نہ صرف فوجی بھرتی بلکہ ہر قسم کی مدد دینے سے انکار کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ کہ مسلمانوں نے سرکاری نوکریاں تک چھوڑ دی تھیں۔ مسلمانوں کے لیڈر مولانا محمد علی۔ شوکت علی۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ ہزاروں مسلمانوں کو گرفتار کر کے جیل خانے بھر دیئے تھے۔ غرضیکہ مسلمان کسی صورت سے بھی ترکوں کے خلاف انگریزوں کی مدد کرنے کو تیار نہ ہوئے۔ اس لئے حکومت کو فوجی بھرتی

کے سلسلے میں بڑی مشکل پیش آئی۔ اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے انگریزی حکومت نے یہ طے کیا کہ شریف حسین (جو شریف مکہ کہلاتا تھا) کے ذریعہ علماء اسلام سے ترکوں کے خلاف کفر کا فتویٰ حاصل کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک شخص خان بہادر مبارک علی خاں کو شریف حسین کے پاس بھیجا گیا۔

شریف حسین نے مکہ اور مدینہ کے بڑے بڑے علمائے دین سے ترکوں کے خلاف فتویٰ حاصل کرنا چاہا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ آخر کار اس نے مجبور ہو کر چند خود غرض اور گمنام مولویوں سے فتویٰ حاصل کر لیا۔ جب یہ فتویٰ مبارک علی خاں کو دکھایا گیا۔ تو اس نے کہا۔ یہ فتویٰ بیکار ہے۔ اس سے ہندوستان کے مسلمان مطمئن نہیں ہوں گے۔ ہاں اگر شیخ الہند مولانا محمود الحسن اس پر دستخط کر دیں۔ تو اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ورنہ نہیں۔

چنانچہ وہی فتویٰ مولانا کے پاس بھیجا گیا اور ان سے اس پر دستخط کرنے کی درخواست کی۔ اس فتوے

میں یہ لکھا تھا کہ ترک کافر ہیں۔ خلافتِ عثمانیہ اسلامی خلافت نہیں۔ اور ترکوں کے خلاف لڑائی جہاد کا درجہ رکھتی ہے مولانا محمود الحسن کو یہ علم تھا کہ فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کرنا اپنے آپ کو تباہی میں ڈالنا ہے لیکن اُنہوں نے اس کی بالکل پرواہ نہ کی۔ اور اس ناجائز فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر شریف حسین سخت ناراض ہوا۔ اس نے مولانا اور ان کے ساتھیوں کو مکّہ معظمہ میں قید کر دیا۔

(۵)

اُدھر مولانا عبید اللہ سندھی کابل میں زور شور سے کام کر رہے تھے۔ چنانچہ مشہور انقلابی مولانا منصور انصاری اور راجہ مہندر پرتاپ بھی اُن کے ساتھ ہو گئے تھے۔ قسطنطنیہ کے ترک لیڈروں اور دوسرے مسلمان بادشاہوں کے ساتھ خط کتابت ہو رہی تھی۔

خط و کتابت کا عجیب طریقہ یہ تھا۔ کہ کابل سے بیل بوٹے والے ریشمی رومال بھیجے جاتے تھے۔ مولانا سندھی اپنا کُل مطلب بیل بُوٹوں ہی میں ظاہر کر دیا کرتے تھے۔ اور زیادہ تعجب اس چیز پر ہے کہ ان ریشمی رومالوں کا جواب بھی سب

جگہ سے اسی صورت میں ملتا تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شیخ الہند اور ان کے ساتھیوں کی تحریک کس قدر محنت اور دماغ سوزی کا نتیجہ تھی۔ یہ وہ وقت تھا۔ کہ شریف حسین نے مکہ میں مولانا کو قید کر دیا تھا۔ اور ادھر کچھ ریشمی رومال انگریزی جاسوسوں نے راستہ میں پکڑ لیے تھے۔ انگریزی حکومت نے غور کیا۔ تو یہ رومال مولانا کی تحریک کی ایک کڑی معلوم ہوئے۔

چنانچہ انگریزی حکومت نے ان رومالوں کا پتہ چلانے کے لئے ایک کمیٹی (رولٹ کمیٹی) کے نام سے بنائی۔ اس کمیٹی نے تحقیقات کر کے ان ریشمی رومالوں کو ریشمی خطوط کا نام دیا اور لکھا کہ شیخ الہند نے حکومت برطانیہ کا تختہ الٹنے کے لئے یہ کام کیا ہے۔

ادھر جب انگریزی حکومت کو یہ اطلاع ملی کہ مولانا محمود الحسن نے فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے تو اُن کو یہ یقین ہو گیا۔ کہ وہ ترکوں سے ملے ہوئے ہیں۔ اور اسلامی ممالک کو انگریزوں کے خلاف متحد کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے شریف حسین کو لکھا کہ مولانا محمود الحسن

اور اُن کے ساتھیوں کو انگریزی حکام کے حوالے کر دیا جائے ؛

(۶)

عرب میں یہ دستور ہزاروں سال سے چلا آتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی عرب کی پناہ میں آجائے - تو وہ اُسے اُس کے دشمن کے حوالے ہرگز نہیں کرتا تھا - خواہ ایسا کرنے سے اس کی جان بھی کیوں نہ چلی جائے - عرب اس دستور کو اپنی زندگی کا ایک اصول بنا چکے تھے - چنانچہ مفتیٔ فلسطین سید امین الحسینی جب شاہ مصر کی پناہ میں آ گئے - تو انہوں نے انگریزوں کی دھمکی کے باوجود مفتی صاحب کو انگریزوں کے حوالے نہ کیا - اِسی طرح جب عراق کا وزیر اعظم سید رشید العالی الجیلانی سلطان ابن سعود کی پناہ آیا - تو اُسے بھی دشمنوں کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا - لیکن شریف حسین نے عربوں کے اصول کے خلاف مولانا محمود الحسن اور اُن کے ساتھیوں کو جدّہ میں انگریزی حکام کے حوالے کر دیا - جدّہ سے انہیں مصر کی بندرگاہ اسکندریہ پر لایا گیا - اور پھر وہاں سے قاہرہ

(مصر) کے ایک جیل خانہ میں پہنچا دیا۔ مولانا اور ان کے ساتھی بڑی مدّت تک اس جگہ قید رہے اور انہیں بڑی بڑی سختیاں دی گئیں۔ کچھ عرصہ تک انہیں جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند رکھا۔ تاکہ وہ موت کے ڈر سے اپنا روّیہ بدل دیں۔ حالانکہ وُہ بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ اور قید کی سختیوں اور دوسرے تفکّرات نے انہیں بہت کمزور کر دیا تھا۔ باوجود ایسی حالت ہو جانے کے ان کے پائے استقلال میں کوئی کمی نہ آئی۔ اور وہ برابر یہی کہتے رہے کہ ترکوں اور انگریزوں کی لڑائی اسلام اور کُفر کی لڑائی ہے۔

آخر انگریزوں نے تنگ آکر مولانا اور انکے ساتھیوں پر مصر کی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا اور انہیں جلاوطن کر کے جزیرہ مالٹا روانہ کر دیا۔ کیونکہ یہ جزیرہ ان دنوں جنگی قیدیوں کا ایک بڑا کیمپ بنا ہوا تھا۔

(۷)

سنہ ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم ختم ہوئی۔ اور قیدیوں کو مالٹا سے نکالنے کا کام شروع ہو گیا۔ تو سب سے اخیر

میں مولانا کو وہاں سے نکال کر پھر قاہرہ پہنچا دیا گیا - اور چند ماہ کے بعد انہیں ایک جہاز میں سوار کر کے ہندوستان روانہ کر دیا - جب جہاز بمبئی کے قریب پہنچا تو انہیں اطلاع دی گئی - کہ وہ اب آزاد ہیں - اور ہندوستان میں ان کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں ہو گی ؃

جب مولانا یہاں پہنچے - تو خلافت کی تحریک زوروں پر تھی - خلافت کمیٹی کی طرف سے بمبئی میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا - بمبئی سے دہلی پہنچے - اور چند دن تک ڈاکٹر انصاری کے پاس مقیم رہے ؃

مسلمانوں کے محبوب لیڈر اور تحریک خلافت کے بانی مولانا محمد علی جوہر اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں بھی قید سے رہا ہو کر دہلی پہنچ گئے تھے - وہ مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے ایک کالج جامعہ ملیہ کے نام سے دہلی میں قائم کر رہے تھے - چنانچہ مسیح الملک مرحوم اور مولانا محمد علی مرحوم نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو اسلامی دنیا کے سب سے بڑے بزرگ حضرت شیخ الہند کے مبارک ہاتھوں سے اس درسگاہ کی سنگ بنیاد رکھوائی گئی -

اس کے بعد دہلی سے مولانا دیوبند چلے آئے اور پھر اپنی دینی اور سیاسی مصروفیات میں لگ گئے۔ جب تک زندہ رہے۔ مسلمانوں کی دینی اور سیاسی خدمات انجام دیتے رہے۔ انہیں مرتے دم تک یہی خواہش رہی۔ کہ مسلمان انگریز کی غلامی سے آزاد ہو کر دُنیا میں عزّت کی زندگی بسر کریں۔ لیکن یہ آرزو اُن کی زندگی میں پوری نہ ہوئی ؛

آخر ۱۹۲۱ء میں یہ علم و عمل کا چمکتا ہوا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا اور دیوبند میں مدفون ہوئے ؛

سعد زاغلول پاشا

(۱)

سعد زاغلول پاشا ۱۸۵۹ء میں مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں آبیانہ میں ایک مصری کسان کے گھر پیدا ہوئے۔ ہونہار اور ذہین تھے۔ گاؤں کے ایک مدرسہ میں پڑھنا لکھنا سیکھا۔ اور قرآن شریف بھی حفظ کر لیا۔ اس کے بعد مصر کی مشہور اسلامی یونیورسٹی قاہرہ میں داخل ہو گئے ؛

جامعہ ازہر میں سعد پاشا کی ملاقات مفتی محمدؐ عبدہٗ (جو سید جمال الدین افغانی کے نامور شاگرد تھے) سے ہو گئی۔ اس وقت مفتی محمدؐ عبدہٗ آزادی کے متوالے مصری نوجوانوں کے لیڈر تھے۔ سعد پاشا نے مفتی صاحب کی صحبت میں رہ کر آزادیٔ وطن کا سبق حاصل کیا۔ اتفاق سے ۱۸۷۱ء میں

سید جمال الدین افغانی بھی دوبارہ مصر پہنچ گئے۔ سعد پاشا نے بھی سید صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور ان کی مجلسوں میں شریک ہونے لگے۔ سید صاحب ایک نڈر مردِ مجاہد اور اسلامی تہذیب و اخلاق کا نمونہ تھے۔ سید صاحب کی تعلیم سے سعد پاشا کے دِل میں آزادی کی تڑپ پیدا ہو گئی۔ لیکن سعد پاشا اپنی تعلیم کی تکمیل میں مصروف رہے۔ کچھ عرصہ بعد جامعہ ازہر کی تعلیم سے فراغت حاصل کر کے اور وکالت کی سند لے کر ایک سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔

اس وقت ۱۸۷۹ء میں مصر کا بادشاہ توفیق پاشا انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ اُس نے وطن کے آزادی پسند مصریوں کو کچلنے کے لئے انگریزی فوجوں کو مصر میں بلا لیا۔ انگریز تو اس سنہری موقعہ کی تاک لگائے بیٹھے ہی تھے۔ لہٰذا انہوں نے فوراً مصر پر مکمل قبضہ کر لیا اور اپنے خونخوار پنجے مصریوں کی گردن میں پھنسا دیئے۔ اور وطن کے سچے خیرخواہوں کو بڑی طرح کچلنا شروع کر دیا۔

انگریزوں کا شروع ہی سے یہ اصول رہا ہے کہ جس

مُلک پر بھی اُنہوں نے قبضہ کیا۔ وہاں کے سرمایہ داروں اور جاگیردار طبقہ کو اپنے ساتھ مِلا لیا اور اپنی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کی کوشش کی۔ مصر میں بھی انہوں نے اپنی اِسی حکمتِ عملی پر عمل کیا۔ انگریزوں کی یہ پالیسی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہے اور اسی وجہ سے وہ بے حد بدنام ہیں۔

(۲)

سنہ ۱۸۸۰ء کے شروع ہوتے ہی مصر میں چاروں طرف انگریزی حکومت کے خلاف ہنگامے برپا ہو گئے۔ کئی خفیہ جماعتیں اپنا کام کرنے لگیں۔ آخرکار مصر کے ایک مشہور لیڈر اعرابی پاشا نے آزادی کی تحریک شروع کر دی اور سعد زاغلول پاشا قوم کے لئے بے دھڑک اِس آگ میں کُود پڑے۔ انہوں نے اعرابی پاشا کے ساتھ آزادی کی تحریک میں اس زور شور سے حصہ لیا کہ تمام دنیا میں ان کی شہرت ہو گئی۔ مگر انگریز کی چالاکیوں اور وطن کے چند غداروں کی کوششوں سے اعرابی پاشا کی تحریک آزادی کامیاب نہ ہو سکی اور سعد پاشا کو گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ لیکن کوئی جرم ثابت نہ ہونے

کی بنا پر انہیں جلد ہی رہا کر دیا گیا۔

اس وقت سعد پاشا کی عمر ۴۲ سال کے قریب تھی اُنہوں نے قاہرہ میں وکالت شروع کر دی۔ چند ہی دنوں میں وکالت اتنی چمکی۔ کہ ان کو اسّی ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہونے لگی۔ حکومت نے بھی اُن کی قابلیت سے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ اور ۱۸۹۸ء میں اُن کو مصر کا جج بنا دیا۔ چونکہ سعد پاشا کو قانون سے بیحد دلچسپی تھی۔ اور قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا وہ اِس شوق کو پورا کرنے کے لئے فرانس پہنچے۔ وہاں انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھی اور قانون کی مزید تعلیم سے فارغ ہو کر واپس آ گئے ۔

فرانس سے واپس آنے کے بعد انہوں نے مصر کے وزیر مصطفےٰ فہمی پاشا کی لڑکی صفیہ سے شادی کر لی۔ حکومتِ مصر نے سعد پاشا کی شہرت اور علمی قابلیت کو دیکھ کر مصر کا وزیرِ تعلیم مقرر کر دیا۔ اب سعد پاشا کو قوم کی اصلاح کا ایک اچھا موقعہ ہاتھ آ گیا تھا۔ اُنہوں نے مصریوں کے اخلاق و عادات کو سنوارنے کی کوشش کی۔ تمام مُلک میں عربی زبان کو لازمی قرار دے دیا اور مصری نوجوانوں کو

تعلیم کے لئے یورپ کے ملکوں میں بھیجنا شروع کر دیا۔ غرضیکہ کچھ دنوں میں مصر کی کایا پلٹ کر رکھ دی ؛

سنہ ۱۹۱۳ء میں جب پہلی مصری پارلیمنٹ قائم ہوئی۔ تو سعد پاشا اُس کے نائب صدر بن گئے۔ سعد پاشا عزم و استقلال کے پکّے اور سچّے مسلمان تھے۔ وہ ایک بہت بڑے مقرر تھے۔ آواز اتنی گرج دار تھی۔ کہ جب تقریر کرتے۔ تو سننے والے دم بخود ہو جاتے تھے۔ مصریوں کو سعد پاشا کی ذات پر بھروسہ اور اعتماد تھا۔ اُنہوں نے پھر آزادی کی تحریک شروع کر دی۔ چونکہ وہ ایک کسان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے کسانوں کی پوری پوری ہمدردیاں اُن کے ساتھ رہیں۔ جاگیردار اور سرمایہ دار یہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ کسان آگے بڑھیں اور ان کی سرداری خطرہ میں پڑ جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے سعد پاشا کی تحریک کی سخت مخالفت کی اور کسانوں کو کچلنے میں انگریزی حکومت کا پورا پورا ساتھ دیا ؛

انگریزوں نے مصر کے عیسائیوں کو بھی مصر کے مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ لیکن مصری عیسائیوں نے عقلمندی کا ثبوت

دیتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ عیسائی اپنے مسلمان مصری بھائیوں کے ساتھ ہیں۔ وہ آزادی کے ایسے ہی خواہش مند ہیں جیسے مسلمان۔ انگریزوں کو چاہیئے کہ وہ مصری عیسائیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور ملک کو فوراً آزاد کر دیں۔

مصری عیسائیوں کے اِس فیصلے سے انگریزی حکومت میں ایک تہلکہ سا مچ گیا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ مصر کی آزادی کے راستہ میں جو یہ آخری رکاوٹ تھی۔ وہ بھی دُور ہو گئی۔ اب مصر پر قبضہ رکھنے کا ان کے پاس کوئی بہانہ نہیں رہا۔ لیکن اُن کی خوش قسمتی سمجھئے۔ کہ سنہ ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔ اور انگریزوں کو اپنے سمندری راستوں کی حفاظت کے سلسلے میں مصر پر قابض رہنے کا بہانہ مل گیا۔ یہ جنگ کئی سال تک جاری رہی۔ اور اس عرصہ میں تمام مصر میں فوجی قانون جاری رہا۔ اِس لئے کوئی تحریک سر نہ اُٹھا سکی۔

(۳)

سنہ ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی۔ تو مصری نوجوانوں نے سعد پاشا کی رہنمائی میں پھر آزادی کی تحریک شروع کر دی نوجوانوں کی جماعت کا نام "انجمن وطن" تھا۔ اُنہوں نے

حکومت برطانیہ کے سامنے اور پیرس کی صلح کانفرنس میں رکھنے کے لئے کچھ تجویزیں مرتب کیں اور اس مقصد کے لئے ایک وفد تیار کیا۔ جس کے لیڈر سعد پاشا تھے اِس وفد کو اتنی شہرت حاصل ہوئی۔ کہ اِسی نام سے وفد پارٹی بن گئی۔ جو اب تک مصر میں موجود ہے۔ جب حکومتِ برطانیہ کو معلوم ہوا کہ مصریوں کا وفد کچھ تجویزیں لے کر پیرس کی صلح کانفرنس میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ تو اُس نے سخت مخالفت کی۔ اور مارچ ۱۹۱۹ء میں سعد پاشا کو گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں قید کر دیا۔ انگریزوں کی اس کوتاہ اندیشی کا نتیجہ یہ نِکلا۔ کہ مصر میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی۔ اور چند انگریز جان سے مارے گئے ؛

انقلاب پسندوں نے قاہرہ اور دیگر چند شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اِس خون خرابہ میں جامع ازہر کے طالب علموں نے بہت زیادہ حِصّہ لیا۔ لیکن انگریزی فوجوں نے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ آخر کار یہ انقلاب کچھ دب سا گیا۔ اور مصریوں نے سختی سے کام لینا بند کر دیا۔ لیکن انگریزی حکومت کی مخالفت برابر جاری رہی۔ انگریز

مصریوں کے اس نرم جذبہ سے عاجز آگئے اور اس بات کے لیے آمادہ ہو گئے۔ کہ مصریوں کے کچھ آنسو پونچھ دیئے جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ایک برطانوی کمیشن۔ کشمیر کمیشن کی طرح مصر پہنچا۔ مصریوں نے اس کمیشن کا مکمل بائیکاٹ کیا۔ کمیشن نے جب یہ دیکھا کہ مصر میں حکومت انگریزی کا ڈھونگ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ تو اُنہوں نے ایسی سفارش بھی کر دی۔ جو مصریوں کے لیے مفید تھی۔ جب یہ رپورٹ حکومتِ برطانیہ کے سامنے رکھی گئی۔ تو اس نے اُسے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ مصریوں کی تحریک آزادی پھر شروع ہو گئی۔ جو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک برابر جاری رہی۔ مصری اس مطالبہ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ کہ مصر کو پوری آزادی دے دی جائے اور انگریز یہاں سے چلتے بنیں سعد پاشا کو کچھ عرصہ تک قید رکھنے کے بعد رہا کر دیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں اُنہیں دوبارہ گرفتار کر کے قصر نیل میں بند کر دیا اور پھر جلاوطن کر کے مالٹا بھیج دیا۔ مگر مصریوں نے اور زیادہ سرگرمی سے اس تحریک میں حصہ

لینا شروع کر دیا۔ انگریزوں نے مصریوں کے جوش کو دیکھ کر پھر صلح کی کوشش شروع کر دی۔ اور سعد پاشا کو بھی رہا کر دیا۔ انگریز مصر کو آزاد کرنے پر آمادہ تو ہوئے۔ لیکن اس شرط پر کہ پہلے انگریزی حقوق کی حفاظت کا یقین دلایا جائے۔

سعد پاشا اِس شرط کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اُن کا یہ کہنا تھا۔ کہ پہلے مصر کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ حکومتِ برطانیہ اور مصریوں میں صلح کی بات چیت ہو گئی۔ اس پر حکومتِ برطانیہ نے ۲۸ فروری سنہ ۱۹۲۲ء کو ایک اعلان جاری کیا۔ جس میں مصر کی آزادی کو برائے نام تسلیم کر لیا ؏

(۴)

چونکہ برطانوی حکومت نے کڑی شرطیں لگا کر مصر کی آزادی کو بالکل بیکار اور بے اثر بنا دیا تھا۔ مصریوں نے ایسی آزادی کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن حکومت برطانیہ نے اس کے باوجود مصر میں نیا قانون جاری کر دیا۔ اور اس آزادی کے پردہ میں کچھ اختیارات تو بادشاہ کو دے دیئے۔ اور کچھ اُن برطانوی افسروں کو سونپ

دیئے۔ جو مصر کی فوج - پولس اور سول کے محکموں پر کنٹرول کرتے تھے۔

قانون کے ماتحت مصری پارلیمنٹ کا جب پہلا انتخاب ہوا تو اس میں سعد پاشا کی پارٹی نے بھی حصہ لیا - پارلیمنٹ کے اُن انتخابات میں وفد پارٹی کو زبردست کامیابی ہوئی اس کے بعد سعد پاشا نے حکومت بنائی اور مصر کی آزادی کے لیئے حکومت برطانیہ سے بات جیت کرنے کے لئے لندن پہنچے - وہ برطانیہ کی اور شرطوں کو تو ماننے کے لیئے تیار تھے - لیکن یہ نہیں چاہتے تھے - کہ سوڈان کو مصر سے الگ کر دیا جائے اور اس پر انگریز قابض رہے - انہوں نے اپنی سی بہتری کوشش کی کہ سوڈان کو مصر سے علیحدہ نہ کیا جائے - لیکن انگریز اس بات پر اڑے رہے کہ سوڈان کو مصر سے الگ رکھا جائے گا - آخر صلح کی بات چیت ناکام ہوگئی۔

کہنے کو تو انگریزوں نے مصر کو آزاد کر دیا تھا لیکن اس پر قبضہ برطانوی فوجوں کا ہی رہا - یہاں تک کہ مصری فوجیں بھی انگریز کمانڈر کے ماتحت تھیں - پولیس کے تمام آفیسر

انگریز تھے۔ اس کے علاوہ مصر کے محکمہ مال اور انصاف پر
بھی انگریزوں کا قبضہ تھا۔ اس قسم کی آزادی سے مصریوں میں
بہت زیادہ جوش پھیل گیا اور کسی مصری نے ۱۹ر نومبر ۱۹۲۴ء
کو مصری فوج کے کمانڈر انچیف کو جو سوڈان کا گورنر جنرل بھی
تھا۔ قتل کر دیا۔ وفد پارٹی نے اس واقع کی سخت مذمّت کی
لیکن اس کے باوجود برطانوی حکومت نے مصری حکومت کو
یہ الٹی میٹم دیا۔ کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر معافی مانگو مجرموں
کو سزا دو پانچ لاکھ پونڈ جرمانہ ادا کرو۔ سوڈان سے مصری
فوجیں نکال لو۔ تمام جلوس و جلسے بند کر دو اور انگریزوں کے
اس حق کو تسلیم کرو کہ وہ غیر ملکی حقوق کے سلسلے میں حکومتِ
مصر پر دباؤ ڈال سکتی ہے۔

حکومت برطانیہ کے یہ مطالبات سراسر ناجائز تھے۔ لیکن
سعد پاشا نے وقت کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے سوڈان
کے معاملہ کو چھوڑ کر باقی تمام مطالبے مان لئے۔ لیکن حکومتِ
برطانیہ کا غصّہ اس سے بھی ٹھنڈا نہ ہوا۔ اُس نے اسکندریہ
کے جنگی خانہ پر قبضہ کر لیا اور سوڈان کو انگریزی نوآبادی
قرار دیا۔ اِس پر مصری فوجوں نے سوڈان میں بغاوت کر دی۔

جسے انگریزوں نے پوری فوجی قوت سے کام لے کر دبا دیا۔ حکومت برطانیہ کی اِس خود سری کو دیکھ کر سعد پاشا کی حکومت نے استعفےٰ دے دیا۔ اِسی سال یعنی ۱۹۲۷ء میں مصری پارلیمنٹ توڑ دی گئی؛

اب برطانوی حکومت کا خیال تھا۔ کہ پارلیمنٹ کے لئے انتخابات میں وفد پارٹی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ لیکن اُن کی توقع کے خلاف وفد پارٹی کامیاب ہو گئی۔ اور اسی دن سعد پاشا کو وزیر اعظم چُن لیا گیا۔ یہ دیکھ کر انگریزوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ اس وقت فواد پاشا مصر کا بادشاہ ہو گیا تھا۔ اُس نے انگریزوں کی شہ پا کر پہلے ہی دن پارلیمنٹ توڑ دی اس کے بعد پھر الیکشن ہوئے۔ تو ان میں بھی وفد پارٹی کامیاب رہی۔ سعد پاشا یہ جانتے تھے۔ کہ اگر اس مرتبہ بھی وہ وزیر اعظم بن گئے۔ تو پارلیمنٹ کا وہ ہی حشر ہوگا۔ جو پہلے ہو چکا ہے۔ چنانچہ اُن کی مرضی سے ثروت پاشا کو وزیر اعظم چُن لیا گیا؛

اِس نئی حکومت کے بننے پر پھر صلح کی بات چیت شروع ہو گئی۔ لیکن جب انگریزوں نے اپنے وہی پُرانے مطالبات

دہرائے۔ تو نئے وزیر اعظم نے بھی انہیں ماننے سے انکار کر دیا ؂

ابھی یہ بات چیت ہو ہی رہی تھی۔ کہ سعد زاغلول پاشا ۲۳ر اگست ۱۹۲۷ء کو ستر برس کی عمر میں انتقال کر گئے اور مصطفےٰ نحاس پاشا ان کے جانشین مقرر ہوئے ؂

مصر آج برطانوی اثر سے بالکل آزاد ہے۔ اگر سوچا جائے تو انہی قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ جو سعد زاغلول پاشا اور اُن کی پارٹی نے تحریک آزادی کے سلسلہ میں دیں سعد پاشا نے اپنے اہل وطن میں آزادی کی ایسی سچی تڑپ پیدا کر دی تھی۔ جو ان کی موت کے بعد بھی اہل مصر کے خون کو کھولا دیتی رہی۔ اور آخر کار انگریزوں کو مصر سے نکلنا پڑا ؂

مولانا محمد علی جوہر

(۱)

مُسلمانوں کے رہنما مولانا محمدؐ علی جوہر ریاست رامپور میں پیدا ہوئے - وہ ابھی دو سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا - اور ان کی پرورش اور تربیت کا بوجھ اُن کی والدہ کے سر پہ آ پڑا - محمدؐ علی کی ماں ایک پڑھی لکھی اور نیک دل خاتون تھیں جو بی اماں کے نام سے تمام ہندوستان میں مشہور ہوئیں - اُنہوں نے محمدؐ علی کی تربیت اس ڈھنگ سے کی کہ انہیں لکھنے پڑھنے میں بہت دلچسپی ہوگئی - مہربان ماں نے بچپن ہی میں یہ بات بھی اُن کے دل میں ڈال دی تھی کہ بڑے ہو کر آزادیٔ

وطن کے لئے انہیں بڑی سے بڑی قربانی سے گریز نہیں کرنا ہوگا۔ محمد علیؒ کے بڑے بھائی کا نام شوکت علیؒ تھا۔ وہ اُن سے انتہائی محبت کرتے تھے۔ اور اُن کی خوشی کو اپنی خوشی پر مقدم سمجھتے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کا اتفاق اور پیار و محبت بہت زیادہ تھا۔ جب کبھی کسی محفل میں بھائیوں کی محبت کا تذکرہ چھڑتا۔ تو ان دونوں بھائیوں کی سچی محبت کو مثال کے طور پہ پیش کیا جاتا۔ ان دونوں بھائیوں کی یہ باہمی محبت آخری دم تک قائم رہی اور وہ ایک دوسرے کو بہت زیادہ چاہتے رہے۔

مثل مشہور ہے کہ "ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات" یہ مثل مولانا محمد علیؒ پر صادق آتی ہے۔ انہوں نے آٹھ سال تک علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور ۱۸۹۶ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ جن حضرات نے انہیں کالج کے زمانے میں دیکھا ہے۔ اُن کا یہ بیان ہے کہ وہ کالج میں ایک زندہ دِل اور ہنس مکھ نوجوان تھے۔ اور حاضر جواب ایسے تھے۔ کہ بڑے بڑے آدمی ان کے سامنے دم نہیں مار سکتے تھے۔ کالج میں آئے دن بحث مباحثے ہوتے رہتے تھے۔

وہ اِن میں بڑی دلچسپی سے حصّہ لیا کرتے تھے ؎

علی گڑھ کالج میں کوئی کھیل ایسا نہ تھا جس میں وہ بڑھ چڑھ کر حصّہ نہ لیتے ہوں۔ لوگ ان کو علی گڑھ کے کھلنڈرے کے نام سے یاد کرنے لگے۔ محمد علی کے دم سے کالج کی رونق اور دلچسپیوں میں بہت ترقی ہو گئی تھی۔ شعر و شاعری کا بہت چرچا رہتا تھا۔ مشاعروں میں اپنا کلام سُنا کر سب سے داد حاصل کرتے تھے۔ جوہرؔ اُن کا تخلص تھا ؎

کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ (آئی سی ایس) انڈین سول سروس کی ٹریننگ کے لئے یورپ گئے۔ لیکن اس میں انہیں ناکامی ہوئی۔ اس میں شاید خدا کی مصلحت تھی کہ ہندوستان کا یہ جوہرِ کامل سول سروس کی کانِ نمک میں جا کر نمک نہ ہو جائے۔ بلکہ سول سروس کے جھمیلوں سے الگ رہ کر ملک اور قوم کی کوئی ٹھوس خدمت کر سکے۔ یہ بات بھی صحیح ہے۔ اگر وہ آئی۔ سی۔ ایس ہو جاتے۔ اور ترقی کرتے کرتے کسی صوبہ کے گورنر بھی بن جاتے۔ تو آج وہ مولانا محمد علیؒ جوہر کی حیثیت سے ہم میں موجود نہ ہوتے اور ہم ان کا نام اس عزّت اور احترام سے نہ لیتے جس

ادب اور محبت سے اب لیتے ہیں۔ لندن سے مولانا محمد علیؒ واپس ہندوستان آگئے۔ اور کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد پھر لندن چلے گئے۔ اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے بیرسٹر بن کر واپس لوٹے۔ تو اُنہیں ریاست رام پور میں ایک اچھی سی ملازمت مِل گئی۔ لیکن اُن کو یہ ملازمت پسند نہ آئی۔ اور اُنہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اِس کے بعد ریاست بڑودہ میں جا کر ملازمت کر لی ؞

مولانا محمد علی مسلسل سات برس تک ریاست بڑودہ میں ملازم رہے۔ ۱۹۰۶ء میں آل اِنڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی۔ مولانا اِس لیگ کے بانیوں میں سے تھے مسلم لیگ کے قاعدے اور قانون مولانا محمد علیؒ نے خود ہی بنائے تھے۔ اُس وقت محمد علیؒ کی ذات سے ہی مسلم لیگ زندہ تھی اور یہ بات سچ ہے۔ اگر محمد علیؒ نہ ہوتے۔ تو مسلم لیگ بھی نہ ہوتی۔ مسلم لیگ کا صدر دفتر علی گڈھ میں تھا۔

محمد علیؒ اپنے سرکاری کام کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ

کا کام بھی کرتے رہے ❖

(۲)

اُس زمانہ میں مسلمانوں کی حالت بہت خراب تھی۔ تعلیم میں وہ ہندوؤں سے پیچھے تو تھے ہی۔ اُن کی سیاسی حالت اس سے بھی گئی گذری تھی۔ اُن کی رہنمائی کے لئے نہ کوئی مسلمان لیڈر رہتا۔ اور نہ کوئی اخبار۔ جو اُن کے حقوق کی نگہداشت کر سکتا۔ اِن حالات کو دیکھتے ہوئے مولانا نے ریاست کی ملازمت ترک کر دی۔ اور مسلمانوں کی خدمت کے لِئے ایک انگریزی اخبار کامریڈ کلکتہ سے جاری کیا ❖

کامریڈ نے نہ صرف مسلمانوں کی خدمت کا پورا پورا حق ادا کیا۔ بلکہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کی حمایت میں بھی بہت کچھ لکھا۔ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی عالمگیر جنگ چھڑی۔ تو کامریڈ نے ترکوں کی حمایت کی۔ اس پر گورنمنٹ نے مولانا محمد علی کو گرفتار کر کے پانچ سال کے لئے قید کر دیا اور کامریڈ بھی بند ہو گیا ❖

۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی۔ تو عالم اسلام کی حالت تشویشناک تھی۔ ترکوں کی عثمانی خلافت دم توڑ چکی تھی فرانس

اور برطانیہ نے عرب کے حصے بخرے کر کے آپس میں بانٹ لئے تھے - اور ہندوستان میں ظلم و ستم کا بازار گرم ہو رہا تھا - حکومت نے جلیانوالہ باغ امرتسر میں گولی چلا کر سینکڑوں ہندو مسلمانوں کو ہلاک کر دیا تھا - ہر صورت سے آزادی کے مطالبہ کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی ؛

مولانا محمدؐ علی پانچ سال کی قید فرنگ سے آزاد ہوئے تو انہیں یہ حالات دیکھ کر بے حد مایوسی ہوئی - انہی دنوں میں کانگریس کا اجلاس امرتسر میں ہو رہا تھا - اس اجلاس میں شامل ہونے کے لئے سیدھے امرتسر پہنچے - اہل شہر نے ملک اور قوم کے اس جلیل القدر فرزند کا شایان شان استقبال کیا ؛

مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور مولانا محمدؐ علی کو یہ یقین تھا - کہ اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان بچوں اور نوجوانوں کو جو تعلیم دی جا رہی ہے - اس سے سوائے اس کے کہ قوم کے بچے بابو بن کر نکلیں اور نوکریوں کے لئے مارے مارے پھریں اور کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا - لہذا مسلمانوں کی درسگاہیں انگریزی حکومت کے اثر سے آزاد ہونی چاہئیں ؛

چنانچہ اس تعلیم کی ابتدا اُنہوں نے علی گڈھ کالج سے کرنی چاہی - لیکن بدقسمتی سے اس وقت کالج کا پرنسپل ایک انگریز تھا- اور نواب محسن الملک سرپرست تھے - اُنہوں نے مولانا کے پاؤں کالج میں نہ جمنے دیئے - لیکن حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی نے قوم کے بچوں کو اس زہریلی تعلیم سے بچانے کے لیئے ہمّت باندھی اور علی گڈھ میں ہی نہایت بے سروسامانی اور مجبوری کی حالت میں ڈیرے تمبو کے نیچے ایک کالج قائم کیا- جس کا نام جامعۂ ملیہ اسلامیہ رکھا گیا ؁

مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ کا نصاب تعلیم بھی خود ہی بنایا. اور مشہور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین خان کو اس کا پرنسپل مقرر کیا - مولانا محمد علی کی محبّت اور کشش کا یہ عالم تھا- کہ علی گڈھ کے اکثر پروفیسر اور طالب علم بے سروسامان جامعہ ملیہ میں کھنچے چلے آئے -آخر کار وہ جامعہ ملیہ کو علی گڈھ سے دہلی لائے اور وہاں ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کو حضرت شیخ الہند کے مُبارک ہاتھوں سے اس کا بنیادی پتھر رکھوایا - قوم نے مولانا محمدؐ علی کو جامعۂ ملیہ کا پہلا امیر (چانسلر) بنایا- چونکہ نیّت نیک تھی- اللہ تعالیٰ نے برکت عطا فرمائی اور یہ چھوٹا

سا پودا بڑھ کر ایک تناور درخت بن گیا۔

جنگ عظیم ختم ہوئی اور ترکوں کو شکست ہوئی۔ فلسطین شام۔ عراق پر برطانیہ اور فرانس نے قبضہ جما لیا تو ہندوستان میں مسلمان بہت بے چین ہوئے۔ ادھر ترکی میں مصطفی کمال پاشا کی رہنمائی میں نوجوان ترکوں نے آزادی کی جنگ شروع کر دی اور انگریز اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ ترکوں کو مٹانے پر آمادہ ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر مولانا ۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی کا ایک وفد لے کر لندن پہنچے۔ اور عراق۔ شام فلسطین اور ترکی کے مسلمانوں کی آزادی کی کوشش کرنے لگے لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی اور ہندوستان واپس آ گئے۔ یہاں پہنچ کر خلافت کمیٹی اور کانگریس میں ترک موالات کی تحریک پاس کرائی (انگریزی حکومت سے ہر قسم کا تعلق توڑ لیا) ترک موالات میں نہایت سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ اس وقت کانگریس اور خلافت دونوں جماعتیں متحد ہو کر کام کر رہی تھیں۔ مولانا محمد علی کو دونوں کا کام کرنا پڑتا تھا۔ درحقیقت کانگریس کے بے جان لاشے میں محمد علی کے دم سے دم آیا تھا انہوں نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک طوفانی دورہ

کر کے حکومت کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکا دی تھی جس جگہ پہنچے - قوم نے سر اور آنکھوں پر بٹھایا - چاروں طرف سے محمد علی، شوکت علی زندہ باد کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں - ملک میں جگہ جگہ انہوں نے تقریریں کیں اور کھلے لفظوں میں انگریزوں کے ظلم وستم کا کچا چٹھا بیان کیا - آخر ۱۹۲۱ء میں قوم و ملک کی خدمت اور صاف گوئی کے جرم میں گرفتار کر لیا اور کراچی لے جا کر مقدمہ چلایا اور دو سال کے لیے جیل میں بند کر دیا ٭

حکومت نے تو مولانا محمد علی کو جرم بے گناہی میں قید کر دیا تھا - لیکن ان کی ضعیف والدہ بی اماں اور بیگم صاحبہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکل آئیں - جو کام وہ ادھورا چھوڑ گئے تھے - اس کو دونوں خاتونوں نے پورا کر دکھایا - ملک کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہ چھوڑا - جہاں پہنچ کر مسلمانوں کو خواب غفلت سے نہ جگایا ہو - لاکھوں روپیہ چندہ اکٹھا کر کے بھاور ترکوں کے پاس بھیجا - لیکن اپنی تمام زندگی تنگ دستی میں گذاری - مسلمانوں نے ان پر سونے کی بارش کی - لیکن انہوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ٭

جیل سے رہا ہونے کے بعد مولانا محمد علی ۱۹۲۲ء میں
میں آل انڈیا کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور پھر سیاسی
سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود
کی طرف سے دنیا کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس مکّہ میں ہوئی۔
جس میں انہوں نے نہایت ہی بے باکی اور دلیری سے سلطان
کی بعض کارروائیوں پر سخت نکتہ چینی کی۔ اسی زمانہ میں انہوں
نے ایک اردو اخبار "ہمدرد" جاری کیا۔ یہ اخبار بھی کامریڈ
اخبار کی طرح بہت مقبول ہوا ؛

مولانا محمد علی خود اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ اگرچہ تندرستی
خراب ہو چکی تھی۔ لیکن قوم کی خاطر انہوں نے صحت کی پروا
نہ کی۔ تمام تمام رات بیٹھے ہوئے لکھتے رہتے تھے ؛

اس اخبار میں اُن کے لکھے ہوئے جو مضامین چھپے۔ ان
سے یہ ثابت ہو گیا۔ کہ وہ نہ صرف انگریزی زبان پر ہی قدرت
رکھتے ہیں۔ بلکہ اردو پر بھی انہیں بہت زیادہ عبور ہے۔ یہ
اخبار ۱۹۲۹ء تک جاری رہا۔ پھر بند ہو گیا ؛

تحریک ترک موالات ابھی جاری ہی تھی۔ کہ انگریزی حکومت
نے ایک اور چال کھیلی۔ شردھانند دہلی میں ایک آریہ تھا۔

حکومت نے اس کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ چونکہ شردھانند پہلے کانگریس میں رہ چکا تھا۔ اِس لئے وہ تحریک ترکِ موالات کو تباہ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اُس نے شدھی اور سنگٹھن کی تحریک چلانی شروع کر دی۔ جس کا صاف مطلب یہ تھا۔ کہ مسلمانوں کو آریہ بنا لیا جائے۔ اور بقیہ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو اتفاق کر لینا چاہیئے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں جینا دوبھر ہو جائے۔ بڑے بڑے کانگریسی ہندو درپردہ اور کھلے بندوں شردھانند کی مدد کرنے لگے اور ترکِ موالات اور ملک کی آزادی کے سوال کو شدھی کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا۔ چوٹی کے کانگریسی ہندوؤں نے بھی اس تباہ کن تحریک کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ بلکہ وہ بھی اِس حمام میں ننگے ہی نظر آئے۔ آخر کار غازی عبدالرشید نے جنونی شردھانند کو پستول کی گولی کا نشانہ بنا دیا۔ جس کا نتیجہ ہندو مسلم فساد کی شکل میں ظاہر ہؤا۔ تمام ہندوستان میں ہندو اور مسلمان خوب لڑے۔ اور انگریز کھڑے تماشہ دیکھتے رہے ۔

(۲۳)

مولانا محمد علی بدلتے ہوئے حالات کو دیکھ کر کانگریس سے خوش نہیں تھے ۔ اُن کا خیال تھا کہ فرقہ پرست ہندو لیڈروں نے کانگریس میں شامل ہو کر اس میں ہندووانہ رنگ بھر دیا ہے اور کانگریس کے چور دروازہ سے داخل ہو کر فرقہ پرستی کا زہر پھیلا رہے ہیں ۔ مولانا نے سنجیدگی سے سوچا ۔ اور کانگریس میں شامل رہنے سے مسلمانوں کا نقصان دیکھ کر اس سے فوراً علیحدہ ہو گئے ؎

۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس لندن میں ہونی طے پائی ۔ اُن دنوں مولانا محمد علی کی صحت خراب تھی ۔ اور وہ اس قابل نہیں تھے ۔ کہ اس میں شامل ہونے کے لئے سمندر کا سفر اختیار کر سکیں ۔ لیکن اُنہوں نے قوم کے فائدہ کو اپنی صحت پر مقدم جانا اور لندن روانہ ہو گئے ۔ وہاں پہنچ کر اُنہوں نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام بہت مصروفیت میں گزارے ۔ جس سے اُن کی صحت اور بھی زیادہ خراب ہو گئی ۔ ڈاکٹروں اور دوستوں نے انہیں مکمل طور پر آرام کرنے کا مشورہ دیا ۔ مگر دھن کے پکے اس انسان اور اسلام کے بہادر فرزند نے

ان کی ایک نہ سُنی۔ اور کانفرنس کے مباحثوں میں سرگرم حصّہ لیتے رہے۔ گول میز کانفرنس میں اُنہوں نے انگریزوں کو مخاطب کرتے ہوئے جو آخری لاجواب تقریر کی۔ وہ دُنیا کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی اور حکومت برطانیہ کی چالاکی کا پول کھولتی رہے گی۔ اُنہوں نے حکومت برطانیہ کے بڑے بڑے ارکان کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت بےباکی سے گرج کر کہا:۔

"ہمیں تجاویز کی ضرورت نہیں اور نہ اس بات کی پروا ہے۔ کہ آپ ہمارے لِئے کسی قسم کا آئین تیار کرتے ہیں ہمیں تو انسانوں کی ضرورت ہے۔ کاش سارے انگلستان میں ایک فرد بھی ایسا ہوتا۔ جو انسان کہلانے کا مستحق ہوتا۔ میں ہندوستان کو آزاد کرانے کے لِئے لندن آیا ہوں اور آزادی کا پروانہ لے کر واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں ایک آزاد ملک میں تو مرنا پسند کرونگا۔ لیکن غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔ اگر آپ ہندوستان کو آزاد نہیں کریں گے تو مجھے آپ کو قبر کے لئے اپنے ملک میں زمین دینا ہوگی۔ آپ نے ہندوستان کو مردانہ

اوصاف سے عاری کر دیا ہے ۔ وہاں ۳۵ کروڑ انسان بستے ہیں اور ہر سال لاکھوں کی تعداد میں پلیگ اور قحط کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ اگر انہیں انگریز کی گولیوں سے مرنا پڑا ۔ تو وہ اس سے گریز نہیں کریں گے ۔ ہم آزاد اور متحد ہند کے لئے جان تک کی بازی لگا سکتے ہیں جس دن ہم میں آزادی کی سچی تڑپ پیدا ہو گئی اور ہم نے متحد رہنے کا فیصلہ کر لیا ۔ اُس دن ہندوستان کی زمین آپ کے لیے تنگ ہو جائے گی ۔ اصل مسئلہ جو ہمارے لئے بہت زیادہ پریشانی کا موجب ہے ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہے ۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے ۔ یہ آپ لوگوں کا ہی پیدا کیا ہوا ہے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" آپ کی حکومت کا پرانا اصول ہے ۔ لیکن یہ بات یاد رکھیئے ۔ کہ جس دن اتفاق سے رہنا منظور کر لیا ۔ اُسی دِن سے آپ کی حکومت ختم ہو جائیگی ۔ ہم یہ ارادہ لے کر اس کانفرنس میں شریک ہوئے ہیں ۔ کہ اب ہم میں پھوٹ نہیں پڑے گی

مولانا محمد علی کی اس تقریر نے دُنیا کی آنکھیں کھول دیں

ادھر ایک حکومت کو یہ معلوم ہو گیا کہ انگریز ہندوستان میں اپنی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے کس مکاری سے کام لے رہے ہیں۔ مولانا کی صحت روز بروز خراب ہو رہی تھی۔ اور کئی امراض نے ایک ساتھ اُن کو گھیر لیا تھا۔ آخر ۴ جنوری ۱۹۳۰ کو گول میز کانفرنس کی ایک کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے ان کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔ اور ان کی پیشین گوئی حرف بحرف سچ نکلی۔ کہ اب میں غلام ملک میں جانا پسند نہیں کرونگا اور میری قبر اسی آزاد ملک میں ہی بنے گی۔ ہندوستان میں اس شیر دل مجاہد کی وفات کی خبر سُنی گئی۔ تو ان سے محبت کرنے والے کلیجہ تھام کر بیٹھ گئے۔ مسلمان زارو قطار رونے لگے ملک و قوم کے درد سے تڑپنے والا نہ رہا۔ اور ملک میں ہر طرف اُداسی چھا گئی ؎

تو لیلائے ملت کا مجنوں بنا تھا
تجھے روئے گی اور رہند برسوں

آپ کی لاش کو ہندوستان لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن جب آپ کی وفات کی خبر ہندوستان پہنچی۔ تو سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین نے بھی خواہش کی اور

تار بھیجا اور درخواست کی - کہ مولانا محمد علی کی لاش کو ہندوستان لے جانے کے بجائے بیت المقدس لائیے - تاکہ اسلام کے شیدائی کو ہزاروں پیغمبروں کی قبروں کے پاس دفن کیا جائے۔ چنانچہ آپ کی لاش بذریعہ ہوائی جہاز وہاں لیجائی گئی - اور وطن سے بہت دُور اس مقدس سرزمین میں مدفون ہوئے جس پر خدا نے اپنی برکت نازل فرمائی ہے ؛

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

انصاف پریس لاہور ریلوے روڈ میں چھپی اور مینجر پنجاب بک ایجنسی نے شائع کیا

علّامہ اقبال

(۱)

ہندوستان میں سینکڑوں ہی شاعر پیدا ہوئے۔ مگر اُن میں سے صرف گنتی کے چند ایسے ہوں گے۔ جنہوں نے گل و بلبل اور زُلف و رُخسار کے جھمیلوں سے نکل کر قوم کی اصلاح کی طرف توجّہ کی ہو اور اپنی شاعری سے سوئی ہوئی قوم کو جگایا ہو۔ اُن چند شاعروں میں سے ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

علامہ مرحوم کو فارسی زبان پر عبور حاصل تھا اور زیادہ تر فارسی میں ہی شعر کہتے تھے۔ لیکن اُردو زبان پر بھی انہوں نے زبردست احسان کیا۔ فارسی الفاظ کو ایسی خوبصورتی

گے ساتھ اُردو میں شامل کر دیا کہ زبان میں ایک شیرینی پیدا ہو گئی۔ علامہ اقبال نے انسانی زندگی کو نہایت قریب سے دیکھا تھا اور اس کے اچھے اور بُرے نقش و نگار سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ وہ زندگی کی حقیقت کو عام شاعروں کی راہ سے ہٹ کر اپنے خاص انداز میں بیان کر جاتے تھے خدا نے اُن کے کلام میں ایسا درد دیا تھا۔ جس سے قوم کے تنِ مردہ میں زندگی کی لہر پیدا ہو گئی۔

وہ مسلمانوں کے سچے خیر خواہ تھے اور انہیں دنیا میں آزاد اور سر بلند دیکھنا چاہتے تھے۔ اِسی لئے انہوں نے غافل مسلمانوں کو پاکستان کے نام سے آشنا کیا تھا۔

علامہ اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کشمیری پنڈتوں کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے۔ جو چند پشتوں سے مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا اقبال کی ابتدائی تعلیم تو گھر پہ ہوئی۔ جہاں انہیں قرآن شریف اور چند دینی کتابیں پڑھائی گئیں۔ اِس کے بعد سیالکوٹ کے مشن ہائی سکول میں داخل کر دیا گیا۔ اقبال بچپن ہی میں بے حد ذہین واقع ہوئے تھے۔ اور ان کے استاد اُن کی

ذہانت کو دیکھ کر یہ کہا کرتے تھے کہ یہ ہونہار بچہ کسی دن آسمان شہرت پر سورج بن کر چمکے گا۔ ایک دن وہ ذرا دیر سے اسکول میں پہنچے۔ تو استاد نے کہا " اقبال آج تم دیر سے آئے ہو " اقبال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا " اقبال دیر ہی سے آیا کرتا ہے "۔ ایک کمسن بچہ کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ظاہر کرتے تھے۔ کہ آئندہ زندگی میں کسی بڑے مرتبے پر پہنچے گا۔

یہ ایک قدرتی بات ہے۔ کہ جب کوئی جوہر قابل دنیا میں آتا ہے۔ تو خدا اس کی تعلیم و تربیت کا بھی مناسب بندوبست کر دیتا ہے۔ اقبال کے معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ اور انہیں ایک ایسے استاد کی توجہ میسر آگئی۔ جس نے انہیں قابل قدر انسان بنا دیا۔ یہ استاد شمس العلما مولانا سید میر حسن تھے۔ انہوں نے یہ بھانپ لیا تھا۔ کہ اقبال ایک دن مصلح قوم بنے گا۔ اور قوم کی ڈگمگاتی کشتی کو سلامتی سے کنارے لگنے میں مدد دے گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تمام قابلیتیں اس ہونہار بچہ کی تعلیم و تربیت پر صرف کر دیں۔ اور اقبال آخر کار صحیح معنوں میں اقبال

ثابت ہوا - خود علامہ اقبال کو بھی ساری عمر یہی احساس رہا
کہ انہیں انسانیت کے اس بڑے درجہ اور مرتبہ پر پہنچانے
والے شمس العلماء مولانا میر حسن ہیں۔ چنانچہ جب وہ اعلیٰ تعلیم
حاصل کرنے کے لئے انگلستان روانہ ہوئے۔ تو انہوں نے
اپنے مشفق اُستاد کے متعلق یہ اشعار کہے ؎

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو

اُردو زبان کے مشہور شاعر داغ دہلوی مرحوم کی شاگردی
کا فخر بھی علامہ اقبال کو حاصل ہوا - اور وہ کچھ عرصہ تک
داغ دہلوی سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے ؛

(۲)

مشن کالج سیالکوٹ سے بی - اے کرنے کے بعد علامہ
اقبال لاہور چلے آئے - اور گورنمنٹ کالج میں داخل ہو
گئے - یہاں بھی انہیں قدرت نے ایک ایسا اُستاد دیا - جو
فلسفہ و حکمت میں فاضل مانا جاتا تھا - یہ اُستاد پروفیسر

آرنلڈ تھے - انہیں سے پڑھ کر علامہ اقبال نے ۱۸۹۹ء میں فلسفہ کا ایم - اے پاس کیا اور اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر ہو گئے - لیکن قدرت نے علم کی پیاس جو اُن میں پیدا کر دی تھی - وہ پروفیسری میں نہ بجھ سکی - اور اُنہوں نے انگلستان جانے کا فیصلہ کر لیا - انگلستان میں اُنہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ کی ڈگری حاصل کی - پھر جرمنی گئے - وہاں انہوں نے ایرانی فلسفہ پر ایک مضمون لکھا جس پر میونخ یونیورسٹی نے انہیں پی - ایچ - ڈی کی ڈگری عنایت کی علامہ اقبال تین سال تک یورپ میں رہے - اس عرصہ میں اُنہوں نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کر لیا - اُنہوں نے ایرانی فلسفہ پر جو مضمون لکھا تھا - وہ دنیا میں بے حد پسند کیا گیا - اور بہت سی یونیورسٹیوں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ اسلامی فلسفہ پر لیکچر دیں - چنانچہ انہوں نے جو لیکچر دیئے - دُنیا میں بہت زیادہ پسند کئے گئے - جب علامہ اقبال واپس لاہور آئے - تو گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے - لیکن ایک سال کے بعد ہی انہوں نے یہ ملازمت چھوڑ دی اور وکالت کرنے لگے - ان کا یہ شغل

۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔ اس دوران میں انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں اسرارِ خودی۔ رموزِ خودی۔ زبورِ عجم پیامِ مشرق۔ ضربِ کلیم اور بالِ جبریل خاص طور پر مقبول ہیں۔ چونکہ علامہ اقبال کی شاعری میں مسلمانوں کی سیاسی اصلاح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس لئے انہوں نے ہندوستان کی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ لیکن اپنے ڈھب سے۔ وہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کو اپنے خیال کے مطابق دیکھتے تھے۔ اور کسی کی سرداری کے قائل نہیں تھے۔ ۱۹۲۶ء میں وہ پنجاب کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت فرمائی۔ اور اس موقعہ پر جو صدارتی تقریر کی۔ وہ بے حد پسند کی گئی۔ اس تقریر میں انہوں نے یہ کہا۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ قومی وطن کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کسی سیاست دان نے یہ نہیں سوچا تھا۔ کہ مسلمانوں کے حقوق کا فیصلہ اس طریقہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس تقریر کے بعد تحریک اتنے زور سے چلی۔ کہ آج اس کا نتیجہ پاکستان کی شکل

ہیں دنیا کے سامنے ہے ⁂

(۳)

مولانا محمد علی کے انتقال کے بعد ۱۹۳۱ء میں جب دوسری گول میز کانفرنس ہوئی۔ تو علامہ اقبال اس میں شامل ہونے کے لئے لندن گئے۔ اِس سفر میں اُنہوں نے اٹلی اور مصر کا دورہ کیا۔ اور واپسی میں ہسپانیہ گئے اور اُندلس کے مٹے ہوئے آثار میں سے مسلمانوں کی عظمت کا سراغ لگاتے رہے۔ یورپ کے اِس سفر سے جب وُہ ہندوستان واپس آئے۔ تو ان کی صحت خراب ہونی شروع ہو گئی۔ بیماری کے باعث اُنہوں نے وکالت چھوڑ دی۔ لیکن شاعری کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور تکلیف کی حالت میں بھی کئی کتابیں لکھ ڈالیں۔ جو شعر و شاعری اور علم و حکمت کی مستند کتابیں مانی جاتی ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے آخری دِنوں میں بے حد کمزور ہو چکے تھے۔ اور دمہ کے شدید حملہ کی وجہ سے بولنے کی قوت ختم ہو چکی تھی ⁂

عین اس وقت جب کہ ہندوستان کے مسلمان غلامی کی طویل نیند سے بیدار ہو رہے تھے۔ اور طلوع ہوتے

ہوتے ہوئے آزادی کی کرنیں مسلمانوں کے خون کو گرما رہی تھیں۔ تو قوم کا غمخوار اور دُنیا کا سب سے بڑا شاعر باغ جنت کو سدھار گیا

انا للہ وانا الیہ راجعون

شاہی مسجد لاہور کے احاطہ میں بارہ دری کے پاس ان کو دفن کیا گیا - ان کے مزار کے اُوپر سنگ سُرخ کا مقبرہ زیر تعمیر ہے ؛

قائد اعظم

(۱)

اُنیسویں صدی کے آخری نصف حصہ میں ہندوستان کے مسلمانوں پر جو بیتی۔ وہ ایک بڑی لمبی اور دردناک کہانی ہے۔ انگریزی حکومت نے مسلمانوں کو اس درجہ کچلا تھا۔ کہ وہ ہندوستان میں ایک غریب قوم بن کر رہ گئے۔ مسلمانوں پر انگریزوں نے جو مظالم توڑے۔ اُن کی تہ میں یہ جذبہ کارفرما تھا۔ کہ کہیں اس راکھ میں دبی ہوئی کوئی چنگاری پھر نہ چمک اُٹھے۔ اور انگریز کی حکومت کو جلا کر ہندوستان میں اسلامی حکومت نہ قائم کر دے۔ یہ زمانہ مسلمانوں کے لئے

بڑے صبر اور استقلال کا تھا۔ اپنی بقا کے لئے غیر ملکی حکومت سے ٹکر لینا موت کو دعوت دینا تھا ۔

زندگی اور موت کی اس کشمکش کے دور میں خدا نے سر سید احمد خاں کو مسلمانوں کی دستگیری اور رہنمائی کے لئے بھیج دیا۔ سر سید احمد خان نے بڑی احتیاط سے کام لیا۔ اور خوف و نا امیدی کے اس زمانہ میں مسلمانوں کو آنے والی بلاؤں سے محفوظ رکھا۔ سر سید کے بعد ہند کے مسلمانوں کو ایک ایسے شخص کی رہنمائی میسر آئی۔ جس نے اُسے دُنیا کی آزاد قوم کی صف میں لا کھڑا کیا۔ یہ شخص محمد علی جناح تھے جو بعد میں قائد اعظم کے لقب سے مشہور ہوئے ۔

محمد علی ۲۵ ردسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کراچی کے ایک مشہور تاجر تھے۔ جب وہ پانچ برس کے ہوئے۔ تو انہیں ایک پرائمری اسکول میں داخل کرایا گیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ سندھ مدرسہ کراچی میں تعلیم پاتے رہے۔ پھر مشن ہائی سکول میں داخل ہو گئے۔ جہاں سے اُنہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ محمد علی جناح کے والد انہیں اپنے کاروبار میں لگانا چاہتے تھے۔ اور

زیادہ تعلیم دلوانے کے خواہشمند نہیں تھے۔ لیکن ان کے ایک انگریز دوست نے جو محمدؐ علی کی ذہانت سے واقف تھا۔ انہیں یہ مشورہ دیا کہ محمدؐ علی کو مزید تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا جائے ؛

مسٹر جناح کے والد نے اپنے انگریز دوست کے مشورہ کو مان لیا اور انہیں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت بھیج دیا۔ محمد علی کی عمر اس وقت سولہ برس کی تھی۔ چار سال کے بعد ہی جب اُن کی عمر بیس برس کی ہوئی۔ تو انہوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کر لیا۔ لندن میں وہ صرف کتابوں کے کیڑے ہی نہ بنے رہے۔ بلکہ سیاسی کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے رہے۔ اس زمانہ میں ایک ہندوستانی لیڈر دادا بھائی نارو جی پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے کھڑے ہوئے۔ یہ پہلے ہندوستانی تھے۔ جنہوں نے برطانوی پارلیمنٹ کے الیکشن میں حصّہ لیا۔ مسٹر جناح دادا بھائی کو الیکشن میں کامیاب بنانے کے لئے پوری کوشش کر رہے تھے۔ اتنی چھوٹی عمر میں اُنہوں نے اس کام کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ مسٹر جناح آگے چل کر ایک

بہت بڑے سیاست دان بننے والے ہیں ؀

بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد مسٹر جناح اپنے وطن کراچی آگئے۔ اب اُن کے والد کا کاروبار ختم ہو چکا تھا اور گھر کے حالات اچھے نہ تھے۔ وکالت شروع کی لیکن کراچی میں اُن کی وکالت کچھ زیادہ نہ چلی اور وہ بمبئی چلے گئے۔ بمبئی میں ان کی وکالت چمک گئی۔ اور ان کا شمار شہر کے مشہور وکلاء میں ہونے لگا۔ اِسی اثنا میں انہیں پندرہ سو روپے کی ایک عارضی ملازمت پیش کی گئی۔ اور وہ بمبئی کے مجسٹریٹ مقرر ہو گئے۔ ملازمت کی میعاد ختم ہونے کے بعد پھر وکالت شروع کر دی۔ مسٹر جناح کو ابتدا ہی سے ملکی معاملات سے دلچسپی تھی۔ وہ بہت زیادہ مصروف ہونے کے باوجود سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ عوام میں ان کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔ اور ۱۹۰۶ء میں وہ کانگریس کے صدر مسٹر دادابھائی ناروجی کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اور مسٹر دادابھائی ناروجی و مسٹر فیروز شاہ مہتہ و مسٹر گوکھلے جیسے مشہور لیڈروں کے ساتھ کام کرتے رہے ؀

(۲)

سرسید احمد خاں کی کوششوں کے طفیل مسلمانانِ ہند بہت حد تک سنبھل چکے تھے اور اُن میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا۔ کہ اپنی قوم کی ترقی کے لئے ایک علیحدہ جماعت بنانی ضروری ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مسٹر جناح کے لئے اس میں کوئی کشش موجود تھی۔ وُہ محسوس کرتے تھے۔ کہ مسلمانوں کی تنظیم کے لئے اس جماعت کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے مسلم لیگ کی اصلاح کے لئے کوشش شروع کر دی۔ آخر ان کے مشورے سے لیگ کے قاعدے اور کام کے طریقوں میں تبدیلی کر دی گئی۔ اور ایک آزاد خود مختار حکومت کا قیام اس جماعت کا پروگرام بن گیا ؛

جب کانگریس اور مسلم لیگ ملک کی آزادی کے مسئلہ پر متفق ہو گئیں۔ تو ان میں ایک قسم کا اشتراک سا پیدا ہو گیا۔ اور دونوں کے سالانہ اجلاس ایک ساتھ ہونے لگے۔ ۱۹۱۳ء میں مسٹر جناح کی قیادت میں ایک ہندوستانی وفد لندن گیا۔ تاکہ وزیر ہند کی کونسل میں ایک ہندوستانی نمائندے کے لئے گنجائش پیدا کرا سکے۔ جب وہ لندن سے واپس آتے۔ تو ان کی تحریک

پہ مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس بمبئی میں ایک ساتھ ہو نا طے پائے۔ اس تحریک سے ان کا مقصد یہ تھا کہ دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ اور ان میں اشتراک اور یگانگت کی راہ تلاش کی جائے۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ کہ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک کانگریس اور مسلم لیگ میں پورا پورا اتحاد و اتفاق رہا۔ مسٹر جناح کی دلی خواہش یہی رہی کہ ہندو مسلم جھگڑوں کو خوش اسلوبی سے ختم کر دیں اور دونوں قوموں میں ایک ایسی دوستی پیدا کر دیں جو کبھی ختم نہ ہو۔ اُن کی ان ہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ کہ ملک نے ان کو "پیامبر اتحاد" کا خطاب دیا۔ کانگریس نے اُن کی ملکی اور قومی خدمتوں کی یاد بمبئی میں قائم کر دی اور لاکھوں روپیہ صرف کر کے ایک عظیم الشان "جناح حال" تعمیر کرایا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ اس زمانے میں کانگریس اور مسلم لیگ میں کیسا اتفاق اور کتنی دوستی تھی اور مسٹر جناح ملک میں کس قدر ہر دلعزیز تھے۔

جب ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کی سنٹرل اسمبلی قائم ہوئی تو مسٹر جناح بمبئی کے مسلم حلقہ سے اس کے ممبر بن گئے۔ وہاں پہنچ کر اُن کی قانونی قابلیت کے جوہر کھلے۔ وہ سیاست کے

کے زبردست ماہر تھے - اپنی فراست سے پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کا حل ڈھونڈ لیتے تھے - انگریزی زبان پر انہیں پوری پوری قدرت حاصل تھی - اس لئے اُن کی تقریریں اسمبلی میں بڑے شوق اور دلچسپی سے سُنی جاتی تھیں ؛

سنہ ۱۹۱۹ء میں مہاتما گاندھی بھی جنوبی افریقہ سے آکر کانگریس میں شامل ہو گئے - وہ ایک تھوڑے عرصہ کے اندر اندر ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر تسلیم کر لئے گئے - ان کے دو بڑے اصول تھے - عدم تشدد اور عدم تعاون کانگریس نے ان کے عدم تشدد کو اپنے بنیادی اصولوں میں شامل کر لیا لیکن مسٹر جناح کو اس سے اتفاق نہیں تھا - جب وہ کانگریس کو اس بارے میں اپنا ہم خیال نہ بنا سکے - تو انہوں نے استعفیٰ دے دیا - لیکن پھر بھی ان کی یہی کوشش رہی کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں زیادہ سے زیادہ اتحاد باقی رہے ؛

(۳)

سنہ ۱۹۲۶ء میں صوبہ سرحد کو کچھ اختیارات دینے کا سوال سامنے آیا - تو پنڈت موتی لال نہرو نے اس کی مخالفت کی - مسٹر محمد علی جناح پنڈت موتی لال نہرو سے اس معاملہ میں متفق

نہیں تھے۔ اِسی دوران میں اُنہوں نے ہندو مسلم سوال کو حل کرنے کے لیئے ایک فارمولا تیار کیا۔ لیکن کانگریس نے نہرو کے نام سے ایک رپورٹ پیش کر دی۔ چونکہ وہ مسلمانوں کے لیئے نقصان دہ تھی۔ اِس لیئے مسٹر جناح نے اُسے ماننے سے انکار کر دیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ کانگریس مسلمانوں کو رضامند کرنے کے لئے اِس مسئلہ کا کوئی حل تلاش کرتی۔ لیکن کانگریس نے نہ صرف اِس رپورٹ کو منظور کر لیا۔ بلکہ برطانیہ کو یہ دھمکی بھی دی۔ کہ اگر اس نے نہرو رپورٹ کو نہ مانا تو عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی جائے گی۔ مسلم لیگ اور کانگریس میں اختلاف کی ایک بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی۔

ادھر مسٹر جناح نے جون ۱۹۲۹ء میں برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر رامزے میکڈانلڈ کو یہ خط لکھا۔ کہ ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دینے کا فوراً اعلان کیا جائے۔ لہٰذا مسٹر جناح کی اس تجویز پر لندن میں ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس ہونی طے پائی اور اس میں شامل ہونے کے لیئے تمام جماعتوں کے نمائندوں کو دعوت دی گئی۔ کانگریس نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کیا اور سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی مسلمانوں کی طرف سے

اس کانفرنس میں مولانا محمد علی شریک ہوئے تھے ۔

۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس ہوئی جس میں کانگریس نے شامل ہونا منظور کر لیا اور سول نافرمانی بند کر دی ۔ مہاتما گاندھی اس کانفرنس میں کانگریس کے نمائندہ کے طور پر شامل ہوئے اور مسلمانوں کی طرف سے قائد اعظم محمد علی جناح نے اس میں حصّہ لیا ۔ دونوں پارٹیوں میں کئی دن تک بات چیت ہوتی رہی لیکن کچھ فیصلہ نہ ہو سکا ۔ آخر برطانیہ کے وزیر اعظم نے اپنا فیصلہ سُنا دیا ۔ جس میں مسلمانوں کے مطالبات کو کافی حد تک مان لیا گیا تھا ۔ قائد اعظم نے بھی مسلمانوں کی طرف سے یہ فیصلہ منظور کر لیا ۔ لیکن کانگریس نے اسے منظور نہیں کیا ۔ فروری ۱۹۳۴ء میں مسٹر جناح نے مرکزی اسمبلی میں یہ تجویز رکھی ۔ کہ جب تک ہندو مسلم اتحاد کا کوئی حل نہیں ملتا ۔ اس وقت تک مسلمانوں کی نیابت جداگانہ رکھی جائے ۔ کانگریس نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی لیکن اس کے باوجود یہ تجویز منظور ہو گئی ۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے ۔ کہ کانگریس اس وقت مرکزی اسمبلی کی سب سے بڑی جماعت تھی ۔ اور اس کی مدد کے بغیر اس تجویز کا منظور ہونا ایک مشکل کام تھا ۔ لیکن مسٹر جناح نے اپنی خداداد قابلیت

اور فراست سے کام لے کر اسے منظور کرا ہی لیا۔ یہ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا ؛

مسٹر جناح سنہ ۱۹۳۱ء سے سنہ ۱۹۳۴ء تک لندن میں رہے اور ہندوستان کی سیاست سے ان کا بہت کم واسطہ رہ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی عدم موجودگی میں مسلم لیگ کا اثر بہت کم ہو گیا۔ لیکن اُنہوں نے واپس ہندوستان پہنچتے ہی پھر اس جماعت کو از سرِ نو تنظیم کیا اور تھوڑی مدت کے اندر اندر اسے ایک باعمل جماعت بنا دیا۔ سنہ ۱۹۳۵ء کا قانون مسلمانوں کے مطالبات کو پورا نہیں کرتا تھا۔ لیکن مسلم لیگ نے مسٹر جناح کے مشورہ سے اسے منظور کر لیا۔ اس قانون کے ماتحت جب صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ کو اس میں اچھی خاصی کامیابی ہو گئی۔ اب مسٹر جناح نے یہ کوشش کی۔ کہ صوبوں میں مشترکہ وزارتیں قائم کی جائیں لیکن پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کی اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ اگر وہ قائد اعظم کی اس تجویز کو مان لیتے۔ تو ملک تباہی سے بچ جاتا ؛

(۴)

۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے نظام اور پروگرام میں ایک ایک حیرت انگیز انقلاب آیا۔ پہلے وہ صرف درجہ نوآبادیات کی حامی تھی۔ مگر اب اس نے مکمل آزادی کو اپنا نصب العین بنالیا۔ مسلم لیگ کے ۱۹۳۷ء کے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان کے مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور ایک قوم کی حیثیت سے اُن کے وجود کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ اسی سال بنگال اور پنجاب کی وزارتوں نے مسٹر جناح کی سرداری کو تسلیم کرلیا اور وہ مسلم لیگ کے دائرہ اختیار میں آگئیں۔ مسلمان سیاسی اعتبار سے بہت حد تک بیدار ہو چکے تھے۔ مسٹر جناح نے جگہ جگہ تقریریں کرکے مسلم لیگ کی برانچیں قائم کیں۔ اُنہوں نے یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کردی کہ نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کا بلکہ ساری اسلامی دنیا کا مستقبل ان کی کوششوں پر منحصر ہے۔ اگر وہ ہندوستان میں باعزت زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو انہیں متحد ہونا ہوگا۔ مسٹر جناح کے جوشِ عمل نے مسلم لیگ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑادی۔ پہلے وہ صرف بڑے بڑے مسلمان نوابوں کی جماعت تھی۔ لیکن مسٹر جناح کی ان تھک

کوششوں نے اُسے عام مسلمانوں کی جماعت بنا دیا۔ مسلمانوں نے اُن کی بیش قیمت خدمات کے صلہ میں انہیں قائد اعظم کا خطاب دیا۔

۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ نے مسٹر جناح کی تحریکِ پاکستان کی تجویز مان لی۔ پاکستان کا مطلب یہ تھا کہ اُن حصّوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ایک جداگانہ جمہوری حکومت قائم کر دی جائے۔ اور مسلمان اس حکومت کو اپنے ڈھب سے چلائیں۔ کانگریس نے پاکستان کو صرف ایک دھمکی سمجھا۔ کچھ لوگوں نے اسے ناقابلِ عمل اور مضحکہ خیز قرار دیا۔ لیکن مسٹر جناح نے ان باتوں کی کوئی پروا نہ کی اور اپنے کام میں لگے رہے۔ یہ کام کوئی معمولی نہیں تھا۔ اسے انجام دینے کے لئے انہیں وکالت جو کہ لاکھوں روپیہ کی آمدنی کا ذریعہ تھی۔ چھوڑنی پڑی اور اپنی سیاسی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ وہ کافی عمر رسیدہ ہو چکے تھے۔ زیادہ بھاگ دوڑ کرنے کے قابل نہیں تھے۔ لیکن اُنھوں نے پاکستان کو اپنی زندگی کا جز قرار دے لیا۔ اور مسلمانوں کو یقین دلا دیا۔ کہ اگر وہ پاکستان کے حصول کے لئے متحد ہو جائیں۔ تو دُنیا کی کوئی طاقت پاکستان کے قیام کو نہیں روک سکتی۔

(۵)

۱۹۴۰ء میں وزیر ہند نے یہ اعلان کیا تھا کہ جنگ کے بعد حکومت برطانیہ ہر اُس حل کو مان لے گی جو ہندوستان کے ہر فرقہ کے نزدیک قابل قبول ہوگا۔ ۱۹۴۲ء میں جب کرپس مشن نے ہندوستان پہنچ کر مسلمانوں کی جداگانہ حکومت کے مطالبہ کو مان لیا۔ اور جنگ کے بعد ۱۹۴۶ء میں جب صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے الیکشن ہوئے تو مسلم لیگ نے پاکستان کے نام پر ان میں حصہ لیا اور ۴۸۲ نشستوں سے ۴۶۷ نشست جیت لیں۔ حکومت برطانیہ کو یہ یقین ہوگیا۔ کہ سارے مسلمان پاکستان کے حق میں ہیں ؎

۱۹۴۶ء میں ہندوستان میں بغاوت کے کچھ آثار پیدا ہوگئے تھے۔ ادھر حکومت برطانیہ بھی جنگ کی تباہ کاریوں سے کمزور ہو چکی تھی۔ اور ہندوستان کی گڑبڑ کی ذمہ داری اپنے سر نہ لینا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے کچھ وزیروں کا وفد ہندوستان بھیجا۔ وفد نے شملہ پہنچ کر ہندوستان کے لیڈروں سے گفتگو کی۔ آخر کار ایک ایسی اسکیم پیش کردی۔ جس نے مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کو

کسی حد تک مان لیا گیا۔ کانگریس نے بھی اس اسکیم کو تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن اس اسکیم کے کچھ حصّے ایسے تھے۔ جن کا کوئی مطلب صاف ظاہر نہ ہوتا تھا۔ مسلم لیگ اس کا مطلب کچھ سمجھتی اور کانگریس کچھ اور۔ چنانچہ اس بارے میں دونوں جماعتوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور اس مخالفت نے اس قدر طول کھینچا۔ کہ یہ اسکیم ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ کانگریس نے جب یہ دیکھا۔ کہ اب مسلمانوں کے اٹل مطالبہ پاکستان کو دُنیا کی کوئی مخالفت نہیں روک سکتی۔ تو فوراً پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کر کے پاکستان کو تسلیم کر لیا۔ وہ پاکستان جس کو ناقابلِ عمل اور ایک دیوانے کی بڑ کہا جاتا تھا۔ معلوم ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ پنجاب اور بنگال تقسیم کر دیا گیا اور دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت پاکستان وجود میں آ گئی۔ اور مسٹر جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ اُنہوں نے پاکستان حاصل کر کے قوم کو سربلند کر دیا۔ لیکن ابھی ان کا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ مُلک کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا چاہتے تھے۔ کہ اچانک مشرقی پنجاب میں قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ اور لاکھوں کی

تعداد میں مسلمان خانماں برباد ہو کر پاکستان آنے لگے۔ مہاجرین
کی آبادکاری کا ایسا سخت مسئلہ پاکستان کی کمر توڑنے کے لئے
کافی تھا۔ لیکن ان مصیبتوں کے باوجود مسٹر جناح ہرگز ہراساں
نہ ہوئے۔ اور پوری جرأت اور پامردی سے صعوبات کا
مقابلہ کرتے رہے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا۔ کہ پاکستان ان
مشکلات میں زیادہ مدت تک زندہ نہیں رہ سکے گا۔ لیکن مسٹر
جناح نے پاکستان کو محض اپنی قابلیت کے بل بوتے پر بچا لیا۔
اور دنیا نے دیکھ لیا۔ کہ تدبیر اور فراست سے بگڑے ہوئے
کام بھی بن سکتے ہیں ؎

مسٹر جناح کی عمر ۷۱ برس کی ہو چکی تھی۔ مگر اس بڑھاپے
میں بھی وہ نوجوانوں کی طرح کام کرتے تھے۔ انہیں صرف
یہی تمنا تھی۔ کہ اپنی زندگی میں پاکستان کو دنیا کے بڑے بڑے
ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا دیکھ سکیں۔ لیکن قدرت
کو یہ منظور نہ تھا اور ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی رات کو ساڑھے
دس بجے کراچی میں انتقال فرما گئے ؎

رات دن رویا کئے شام و سحر رویا کئے
رونے والے تیرے تجھ کو عمر بھر رویا کئے

غازی عصمت انونو

(۱)

ترکی کے موجودہ صدر جمہوریہ غازی عصمت انونو ترکی کے ایک شہر سمرنا میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام عصمت بے آفندی ہے اور انونو اس لئے کہتے ہیں۔ کہ انونو نام کے ایک مقام پر اُنھوں نے یونانیوں کو شکست دی تھی۔ اُن کے والد قسطنطنیہ کے ایک مجسٹریٹ تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے۔ کہ ان کا بیٹا قانون کی تعلیم حاصل کر کے ان ہی کی طرح ایک مجسٹریٹ بن جائے۔ لیکن عصمت کو قانون کی باریکیوں سے سخت نفرت تھی۔ اُن کا رجحان زیادہ تر فوجی کاموں کی طرف تھا۔ باپ نے یہ دیکھ کر کہ عصمت میں ایک فوجی افسر بننے کی زیادہ قابلیت

موجود ہے - انہیں ترکی کے فوجی سکول میں داخل کر دیا -
جہاں اُنہوں نے دوگنی رات چوگنی ترقی کی - جس کی وجہ سے
جلد ہی اُن کی قابلیت کا سکّہ فوجی افسران کے دِل پر بیٹھ گیا۔
اس کا نتیجہ یہ ہوُا - کہ فوجی اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے
کے بعد انہیں حکومت ترکی نے فوج کی اعلیٰ تعلیم کے لئے
منتخب کیا - اور سرکاری خرچ پر جرمنی کے ایک فوجی کالج
میں بھیج دیا ۔

یہ اس وقت کی بات ہے - جبکہ ۱۹۱۴ء کی جنگ نہیں
چھڑی تھی - اور سلطان عبدالحمید خاں ثانی ترکی سلطنت کا
حکمران تھا - سلطان حکومت کے کاموں میں اپنی من مانی
کارروائی کرتا تھا - کہ جس کی وجہ سے انتظامِ حکومت میں
خرابی پیدا ہوتی تھی - اس لئے ترکوں میں سلطان کی حکومت
کے خلاف بے اطمینانی پھیل رہی تھی - اور ترک نوجوانوں
نے انجمن اتحاد و ترقی کے نام سے غازی انور پاشا کی سرداری
میں ایک خفیہ تحریک شروع کر رکھی تھی - اِس تحریک کا مقصد
حکومت کی بُرائیوں کو دُور کرنا تھا - جرمنی سے واپس آکر
عصمت بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے - اور دن رات

سلطان ترکی کے خلاف کام کرتے رہے۔ آخر عصمت انونو اور ترک نوجوانوں کی قربانیوں سے یہ تحریک کامیاب ہو گئی اور سلطان عبدالحمید کو معزول کر دیا گیا ؎

انگریزوں کی شہ پا کر بلغاریہ نے ترکی پر حملہ کر دیا۔ اور جنگ بلقان شروع ہو گئی۔ تو عصمت اس میں ایک فوجی افسر کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ ان کی کمان کے فوجی انہیں محبّت سے ننھا جرنیل کہا کرتے تھے ؎

اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ عصمت چھوٹے قد اور دُبلے پتلے آدمی ہیں۔ لیکن اس چھوٹے سے سوکھے جسم والے انسان کی جنگی چالوں سے دشمن خائف اور ہراساں رہتے تھے

عارضی صلح ہو کر جب جنگ بلقان ختم ہوئی تو عصمت کو بلغاریہ کے ساتھ صلح کی شرطیں طے کرنے کے لئے چُنا گیا۔ اُنہوں نے بلغاریہ کے ساتھ جو شرائط طے کیں۔ وُہ ترکی کے لئے بہت مُفید اور باعزّت تھیں۔ اس کارنامہ کی وجہ سے عصمت انونو کی سیاست دانی کا شہرہ دنیا میں ہو گیا ؎

(۲)

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ اِس جنگ میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ دوسری طرف برطانیہ فرانس۔ یونان اور دوسری حکومتوں کا گٹھ جوڑ تھا جو اتحادیوں کے نام سے مشہور تھیں۔ اتحادیوں نے ترکی پر حملہ کر کے اپنا جنگی بیڑہ درۂ دانیال میں داخل کر دیا تھا۔ اس وقت مصطفےٰ کمال درۂ دانیال کی ترکی فوج کے کمانڈر تھے۔ ترکی وزیر جنگ نے غازی عصمت انونو کو بھی مصطفےٰ کمال کی مدد کے لئے وہاں بھیج دیا۔ وہاں پہنچ کر عصمت انونو نے اپنی جنگی مہارت کا کمال دکھایا۔ اور مصطفےٰ کمال کی ایسی مدد کی کہ انہوں نے اتحادی بیڑے کے پرخچے اُڑا دیئے۔ اور اُن کو عصمت انونو کے تدبّر اور لیاقت کا لوہا ماننا پڑا۔ اگرچہ درۂ دانیال کی فتح مصطفےٰ کمال کا ایک حیرت انگیز کارنامہ تھا۔ لیکن دراصل یہ فتح عصمت انونو کی جنگی قابلیت کا نتیجہ تھی ؛

اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اتحادی فوجیں قسطنطنیہ کے بازاروں میں گشت لگا رہی تھیں۔ یہ زمانہ

ترکوں کے لئے بڑا نازک تھا۔ ترکی سلطنت کے حصّے بخرے کرنے کے منصوبے باندھنے لگے۔ برطانیہ۔ فرانس۔ اٹلی اور یونان اِس اسلامی حکومت کا تیا پانچہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اِسے مالِ غنیمت کی طرح آپس میں ہضم کر لینا چاہتے تھے عصمت اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ دارالسلطنت قسطنطنیہ میں ایک جگہ چھپے بیٹھے تھے۔ وہ ترکی کو آزاد کرانے کے لِئے اپنی آخری کوشش کرنا چاہتے تھے۔ اور کسی مناسب موقعہ کی تلاش میں تھے۔ لیکن یہ بات ناممکن نظر آتی تھی۔ کہ ترکی پھر ایک آزاد اور خودمختار حکومت کی حیثیت سے دُشمنوں کے سینے پر زندہ باقی رہے گی۔ اِسی ہی اثنا میں انہیں اطلاع ملی کہ مصطفےٰ کمال ملک کی آزادی کو بحال کرنے کے لئے ایک جگہ فوج جمع کر رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی اُن کے افسردہ دِل میں پھر جوش پیدا ہو گیا۔ اور مصطفےٰ کمال کے پاس پہنچنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ آخر انہوں نے ایک اندھی بھکارن کا بھیس بدلا اور اتحادی جاسوسوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر قسطنطنیہ سے نکل جانے میں کامیاب ہو گئے ؂

بھکارن کے بھیس میں جب وہ مصطفےٰ کمال کے کیمپ

میں پہنچے - تو انہیں دیکھتے ہی ترکوں کے حوصلے بڑھ گئے اور انہیں یقین ہو گیا - کہ آزادی وطن کے لئے غازی مصطفیٰ کمال کی کوششیں اب یقیناً کامیاب ثابت ہوں گی - اُنہوں نے بھکارن کے کپڑے اُتارے اور فوجی وردیاں پہن کر مجاہدین کی فوجی تنظیم میں مصروف ہو گئے - مقابلہ یونانیوں سے تھا - مل جل کر جنگ کا سامان شروع کر دیا اور یونانیوں کو شکست پر شکست دینے لگے - غازی عصمت نے انونو کے مقام پر یونانیوں کو زبردست شکست دی اور انونو ہمیشہ کے لئے اُن کا لقب بن گیا ؎

جب ترکوں نے بزدل یونانیوں کو ترکی حدود سے نکال دیا - تو ترکوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر اتحادیوں کے کان کھڑے ہوئے اور انہوں نے فوراً ترکوں سے صلح کی بات چیت شروع کر دی - لوزان کانفرنس کے نام سے ایک صلح کانفرنس ہوئی - اس کا صدر لارڈ کرزن جیسا مغرور انگریز تھا - مصطفیٰ کمال نے عصمت انونو کو ترکی وفد کا لیڈر مقرر کر کے وہاں بھیجا - کانفرنس میں لارڈ کرزن نے تقریر کی اور ترکوں کے خلاف خوب زہر اُگلا - جب وہ

تقریر ختم کر کے بیٹھ گیا۔ تو عصمت انونو اس کی تقریر کا جواب دینے اور ترکوں کے مطالبات پیش کرنے کے لئے اُٹھے۔ انہوں نے اُٹھ کر اتنا کہا۔ کہ "میں کانوں سے بہرہ ہوں میں نے کچھ نہیں سُنا" یہ سُن کر لارڈ کرزن غصّہ سے لال پیلا ہو گیا اور اصل مقصد سے ہٹ کر دوسری گذری ہوئی باتیں دہرانے لگا۔ عصمت انونو کو اب موقعہ مل گیا۔ اُنہوں نے تقریر شروع کر دی۔ اور کھری کھری باتیں کہہ کر ترکی مطالبات کو نہایت صفائی سے پیش کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اُنہوں نے کانفرنس سے یہ منوا لیا۔ کہ ترکوں کو بھی دُنیا میں آزاد اور خود مختار رہنے کا پُورا پُورا حق حاصل ہے۔ چنانچہ اتحادیوں کو بدرجہ مجبوری ترکوں کی آزادی کو تسلیم کرنا پڑا۔ اِس طرح تمام یورپ پر عصمت انونو کی سیاسی عظمت کا رعب طاری ہو گیا۔

(۱۳)

اتحادیوں پر فتح پانے کے بعد ترکی میں ایک آزاد اور جمہوری حکومت ہو گئی۔ اتاترک مصطفےٰ کمال صدر اور غازی عصمت انونو وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ اور پندرہ سال تک برابر ترکی کے وزیر اعظم رہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ترکوں کے

دِل میں اُن کی کِس قدر عزت اور محبت تھی۔ عصمت انونو کے دشمن بھی سایہ کی طرح اُن کے پیچھے لگے رہے اور انہیں ختم کروا دینے کی کوئی کوشش باقی نہ چھوڑی۔ لیکن "جسے اللہ رکھے۔ اُسے کون چکھے" ان کا بال تک بیکا نہ ہو سکا ؎

گذشتہ کئی صدیوں سے یورپ کی عیسائی سلطنتوں اور ترکی میں دشمنی اور بگاڑ چلا آتا تھا اور عیسائی سلطنتیں تُرکوں کو نیچا دِکھانے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔ غازی عصمت انونو کو اس بات کا احساس تھا۔ کہ ترکوں کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے عیسائی طاقتوں سے بنا کر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے وزارت عظمےٰ کا منصب سنبھالتے ہی آس پاس کے ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ ایک مرتبہ جب وہ یونان کے دارالحکومت ایتھنز میں گئے۔ تو اہل یونان نے اُن کا شاندار استقبال کیا۔ حالانکہ انہی یونانیوں کو وہ انونو کے مقام پر ایک عبرت انگیز شکست دے چکے تھے۔ مگر عصمت انونو کی فراست قابل داد ہے کہ انہوں نے یُونانیوں جیسے بدترین دشمنوں کو بھی ترکی کا دوست اور خیر خواہ بنا لیا ؎

۱۹۳۸ء میں صدر جمہوریہ ترکی اتاترک نے انتقال کیا تو ترکوں نے عصمت انونو کو اپنا صدر منتخب کیا۔ اور وُہ آج تک جمہوریہ ترکیہ کے صدر ہیں۔ غازی عصمت انونو کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ وہ دوسری حکومتوں کی طرح سیاسی اور فوجی معاملات کو صرف کاغذ کے پُرزے ہی خیال نہیں کرتے۔ بلکہ ان پر عمل کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ دوسری عالمگیر جنگ میں وہ بالکل غیر جانبدار رہے۔ جرمنی واتحادیوں کی زبردست ترغیب کے باوجود جنگ میں شامل نہ ہوئے۔ اس جنگ کے دوران میں کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ترکی اپنے آپ کو جانبدار رکھنے میں کامیاب ہوگا۔ لیکن اسے غازی موصوف کے سیاسی تدبر کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ اُنہوں نے ترکی کو جنگ کی لپیٹ میں نہ آنے دیا۔ اور ملک وقوم کو تباہی سے بچا لیا ❖

غازی عصمت انونو کی عمر اس وقت کوئی ستر برس کے قریب ہے۔ لیکن اس پیرانہ سالی میں بھی وہ قوم کی ترقی اور بہبودی کے لئے بہت کچھ کرتے رہتے ہیں۔ وہ کانوں سے کچھ بہرے ہیں۔ لیکن لوگوں کا خیال ہے کہ وہ خفیفت میں

بہرے نہیں ہیں - بلکہ یہ بہرہ پن اُن کا ایک سیاسی حربہ ہے - جس سے یورپ کے گنجے سیاست دانوں کو ناک چنے چبوائے ہیں ٭

سُلطان شہریار

(۱)

جب دنیا کی دوسری جنگ عظیم چھڑی ۔ تو جاپانیوں نے بڑی آسانی سے جزائر شرق الہند (انڈونیشیا) پر قبضہ کر لیا اور ولندیز مقابلہ کئے بغیر بھاگ کھڑے ہوئے اُنہوں نے لندن پہنچ کر نیدرلینڈ ایسٹ انڈیز کی جلا وطن حکومت قائم کر لی ۔ اس سیاسی تبدیلی سے قوم پرستوں کو سر اُٹھانے کا موقعہ مِل گیا اور وہ تحریک آزادی جو ولندیزوں کے ظلم و استبداد کے باعث مردہ ہو چکی تھی ۔ پھر جاگ اُٹھی ۔ اس تحریک کے لیڈر سلطان شہریار اور احمد سائیکارنو تھے ۔ اُنہوں نے جاپانیوں سے تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیا ۔

چونکہ یہ جزائر قدرتی وسائل سے مالامال تھے۔ اِس لئے جاپانیوں نے اِن سے خوب فائدہ اُٹھایا اور مقامی باشندوں کو مسلح کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ ضرورت کے وقت ان سے کام لیا جا سکے۔ انہوں نے ملک کی حفاظت کا بندوبست کیا اور انتظامی امور کو انجام دینے کے لئے ایک سنٹرل ایڈمنسٹریٹو کونسل قائم کی۔ اِس کونسل نے ملک کے دفاع اور مقامی باشندوں کے تعاون کے سِلسلے میں کئی قانون نافذ کئے۔ اس کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی بھی زور پکڑتی گئی۔ جاپانیوں کو اس خطرے کا علم تھا۔ لیکن ایک تو ان کے پاس اس تحریک کو دبانے کے لئے وقت نہیں تھا۔ دوسرے انہوں نے یوں بھی اسے ختم کرنا مناسب نہ سمجھا کہ اس سے ملک میں گڑبڑ پھیلے گی۔ اور ان کی جنگی مساعی کو نقصان پہنچے گا۔ وہ یہ چاہتے تھے۔ کہ ملک کے سیاسی لیڈروں کا اعتماد حاصل کریں۔ اور اس طرح سے انہیں عوام کا تعاون حاصل ہو جائے۔ لیکن سلطان شہریار اور احمد سائیکارنو جیسے محبِ وطن لیڈروں نے جاپانیوں کے آلۂ کار بننے

سے صاف انکار کر دیا۔

کچھ مدت تک اتحادیوں کا مقابلہ کرنے کے بعد جاپانیوں کی مزاحمت کی قوت کم ہونے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امریکن جرنیل جنرل میکارتھر نے ڈچ نیو گنی کے کچھ حصہ اور ہالینڈ کی بندرگاہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ یہ علاقہ دوبارہ ولندیزیوں کو دے دیا گیا۔ ولندیزیوں کو یہ خیال ہو چلا تھا کہ شاید انہیں ان کے مقبوضات واپس نہ مل سکیں۔ لیکن جب امریکن افواج اور اسلحہ کے بل بوتے پر یہ دوبارہ جیتا ہوا علاقہ انہیں واپس مل گیا۔ تو انہیں یہ اُمید ہو گئی۔ کہ ولندیزی ایمپائر زندہ رہ سکے گا اور وہ جزائر شرق الہند کو پہلے کی طرح غلام رکھ سکے گی۔ ڈچ نیو گنی میں جنرل میکارتھر کی فوج موجود رہی۔ تاکہ ڈچ حکومت کو جاپانی حملوں سے محفوظ رکھ سکے۔ اب بھی ڈچ نیو گنی کا بہت سا حصہ جاپانیوں کے قبضہ میں تھا۔ اگر جنرل میکارتھر ولندیزیوں کی مدد نہ کرتا۔ تو یہ جاپانی ایک دن کے اندر اندر ڈچ حکومت کا تختہ اُلٹ سکتے تھے۔

(۲)

چونکہ امریکن بیڑا کافی جمعیت میں اس سمندر میں پہنچ چکا تھا اور جاپان کی سمندری طاقت کمزور ہو چکی تھی۔ اس لئے جزائر جاپان اور جزائر شرق الہند کے درمیان کے سمندری راستے پُرخطر ہو گئے اور اس بات کا امکان بہت کم رہ گیا۔ کہ اگر کسی وقت امریکن فوج نے جزائر شرق الہند پر حملہ کر دیا۔ تو جاپان سے کس قسم کی امداد پہنچ سکے گی۔ اِن حالات کو دیکھتے ہوئے جزائر شرق الہند کے جاپانی حکام نے مقامی طور پر ان جزیروں کے دفاع کا بندوبست کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ کوشش کرنے لگے کہ اِن جزیروں کو اس قابل بنا دیا جائے۔ کہ وہ اپنی ضرورتوں کو خود پورا کر سکیں اور بیرونی امداد کے طالب نہ رہیں۔ لیکن جاپانیوں کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی امریکہ نے ناگاساکی اور ہیروشیما پر جو ایٹم بم پھینکے اور ان سے جو تباہی ہوئی۔ اُس سے جاپانیوں کی ہمّت پست ہو گئی اور انہوں نے اتحادی فوجوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے بعد انڈونیشیا (جزائر شرق الہند)

کا انتظام جنوب مشرقی ایشیا کے اتحادی سپریم کمانڈر کے ہاتھ میں آگیا۔ لیکن عملاً اِس کمانڈر کے ماتحت کچھ ساحلی علاقہ تھا۔ جس میں بٹاویہ۔ سُرابایا۔ بنڈونگ۔ سیمارنگ۔ پالم بانگ۔ برٹنگ اور میڈن کے شہر شامل تھے۔ ملک کا اندرونی حصّہ قوم پرستوں کی گورنمنٹ کے قبضہ میں تھا۔ جس کے لیڈر سلطان شہریار اور احمد سائیکارنو تھے۔ قوم پرستوں نے اتحادیوں کو متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے انڈونیشیا کو ولندیزیوں کے حوالے کرنے کی کوشش کی تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔ اُنھوں نے ایک ایسی گورنمنٹ قائم کر لی ہے۔ جو منشور اٹلانٹک کے تقاضوں کو پُورا کرتی ہے۔ اگر اس گورنمنٹ کو ختم کرنے اور ولندیزیوں کو دوبارہ انڈونیشیا پر مسلّط کرنے کی کوشش کی گئی۔ تو یہ منشور مذکور کی خلاف ورزی ہوگی۔ قوم پرست لیڈروں کے اس انتباہ کے باوجود ولندیزوں کو امریکہ اور برطانیہ کی اِمداد حاصل رہی۔ کیونکہ انسانیت اور انصاف کے اِن علمبرداروں کے نزدیک ہر وہ ظلم اور زیادتی انصاف کی حدود میں ہے جو اُن کی مصلحتوں

کو پُورا کرے اور ہر وہ نیکی اور احیائی ظلم اور بے انصافی کا درجہ رکھتی ہے۔ جس سے اُن کے مفاد کو نقصان پہنچے۔ اتحادیوں نے آزادی اور انصاف کے تمام دعوؤں کو پس پشت ڈال دیا۔ اور ولندیزیوں کی کھلم کھلا حمایت کرنے لگے۔ لیکن اس سے قوم پرستوں کے ارادوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ وہ ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ اور اپنی آزادی کو ہر قیمت پر برقرار رکھنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ جب اتحادیوں نے دیکھا کہ یہ کام آسانی سے طے ہوتا نظر نہیں آتا۔ تو برطانوی حکومت کی تحریک پر ولندیز اور قوم پرست نمائندوں میں گفت و شنید کا بندوبست کیا گیا۔ قوم پرستوں کی طرف سے سلطان شہریار اور ولندیزی گورنمنٹ کی طرف سے ڈچ لفٹنٹ گورنر جنرل اس بات چیت میں شامل ہوئے۔ سلطان شہریار نے انڈونیشیا کے لئے مکمل خود مختاری کا مطالبہ کیا اور یہ بھی کہا کہ جزیرہ سماٹرا کو انڈونیشیا کی جمہوری حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ ڈچ لفٹنٹ گورنر جنرل نے اُسے بڑے بڑے سبز باغ دکھائے اور اُسے ڈچ

کامن ویلیتھ آف نیشنز کے چکر میں ڈالنا چاہا۔ لیکن سلطان شہریار نے اس کی ایک نہ مانی۔ اور آخر یہ بات چیت ناکام ہو گئی۔ جب اتحادیوں کے تمام حیلے بہانے بیکار ہو گئے تو امریکہ نے ڈچ فوجوں کو اپنے خرچ سے مسلح کرنا شروع کر دیا اور یہ فوجیں امریکن جہازوں کے ذریعہ انڈونیشیا کے ساحلوں پر اُترنی شروع ہو گئیں۔ اس موقعہ پر ولندیزوں نے ایک ڈرامہ ایک کانفرنس کی شکل میں کھیلا اور وہ لوگ کہ جو انڈونیشی ولندیز گورنمنٹ کے تنخواہ دار اور ایجنٹ تھے۔ انہیں انڈونیشیا کے نمائندے قرار دے کر ان سے بات چیت شروع کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی انڈونیشیا میں اشتراکیت نے سر اُٹھایا اور کمیونسٹوں نے حق پرست لیڈروں کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ ان حالات کو دیکھ کر ولندیزوں کو کچھ اُمید ہو گئی۔ کہ وہ اپنی چالوں میں کامیاب ہوں گے۔ اسی اثنا میں ملکہ ہالینڈ نے انڈونیشیا میں صلح کا ایک کمیشن بھیجا اور جنگ ختم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ آخر حکومت ہالینڈ کے ایجنٹوں کی مدد سے یہ فیصلہ ہوا کہ ایک حکومت یونائیٹڈ سٹیٹز آف انڈونیشیا کے نام قائم ہو۔ وہ ڈچ

یونین میں شامل رہے اور ملکہ ہالینڈ اس کی آئینی حکمران تسلیم کر لی جائے۔ ان سارے ہتھکنڈوں کا انڈونیشیا کی قوم پرست گورنمنٹ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور ولندیزوں کے فریب میں پھنسنے سے انکار کر دیا۔ آخر یہ معاملہ یو۔این۔او میں پہنچا۔ اور فریقین میں صلح صفائی کرانے کے لئے ایک گڈول یعنی دوستی کا مشن انڈونیشیا بھیجا گیا۔ یہ مشن اب تک انڈونیشیا میں موجود ہے۔ لیکن ولندیزوں اور قوم پرستوں میں کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا :

(۳)

سلطان شہریار

سلطان شہریار ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوا۔ اُن کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اپنے ملک کو اغیار کی غلامی سے نجات دلائے اور یہاں ایک آزاد اور خودمختار حکومت قائم کرے۔ اس کام میں اُسے بڑی بڑی مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں اور وہ ڈچ گورنمنٹ کا معتوب رہا۔ جب جاپان نے ولندیزوں کو انڈونیشیا سے نکال دیا۔ تو اُسے اپنے کام کو پورا کرنے کا موقعہ مِل گیا۔ اور انڈونیشیا کی سوشلسٹ پارٹی میں شامل

ہو گیا - جاپانیوں نے اپنے عہد میں اُسے اپنا آلہ کار بنانے کی پوری پوری کوشش کی - لیکن اُس نے صاف کہہ دیا - کہ میں اپنے ملک کی آزادی کو ختم کرنے میں کسی غیر ملکی حکومت کا ایجنٹ بننا نہیں چاہتا - اُن کی اس ہمت اور بلند حوصلگی نے ہالینڈ اور برطانیہ میں اس کی عزّت بڑھا دی اور دونوں ملکوں نے اُن کی نمائندہ حیثیّت کو تسلیم کر لیا - گو انڈونیشیا کی تحریک آزادی کو کامیاب بنانے میں احمد سائیکارنو، محمد عطا اور شریف الدین کا بھی کافی حصّہ ہے - لیکن اس معاملہ میں سلطان شہریار کی شہرت کو کوئی نہیں پہنچا - جاپانیوں کے اقتدار کے بعد جب انڈونیشیا میں جمہوری حکومت قائم ہوئی تو نومبر ۱۹۴۵ء میں وہ اس کا وزیر اعظم بنا - اُس نے اپنی کیبنٹ کو نئے سرے سے ترتیب دیا - اور امور خارجہ اور امور داخلہ کے عہدے اپنے پاس رکھے - جاپانیوں کی شکست کے بعد جب ولندیزی فوجیں انڈونیشیا میں داخل ہونی شروع ہوئیں - تو اُس نے اتحادیوں کو تنبیہ کی کہ انڈونیشیا پر ولندیزی گورنمنٹ مسلط کرنے کی کوشش نہ کی جائے - اگر ایسا کیا گیا - تو انڈونیشیا اپنے تمام وسائل سے کام لے کر

لڑے گا - اور اس وقت تک لڑتا رہے گا - جب تک ایک بھی انڈونیشی زندہ ہے - اور میگزین میں ایک بھی گولی باقی ہے - سلطان شہریار نے حکومتِ امریکہ کی مذمت کی - کیونکہ اُس نے ڈچ فوجوں کو اپنے خرچ سے ہتھیار بند کیا تھا۔

کچھ مدت تک وزیر اعظم رہنے کے بعد سلطان شہریار کا اپنے رفقاء سے اختلاف ہو گیا - وہ کیبنٹ میں اور زیادہ نمائندگی چاہتے تھے - اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اُسے فروری ۱۹۴۶ء میں وزارت عظمیٰ کے منصب سے مستعفی ہونا پڑا - اس کے بعد پھر نیشنل کمیٹی نے کثرت آرا سے اس پر اعتماد کا اظہار کر دیا - اور اس نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۶ء کو نئی گورنمنٹ بنا لی -

سلطان شہریار لگاتار ایک سال تک ڈچ فوجوں کا مقابلہ کرتا رہا - آخر ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو فریقین میں عارضی صلح ہو گئی اور ایک معاہدے کی رو سے ولندیزی گورنمنٹ نے انڈونیشیا کی جمہوریت کو تسلیم کر لیا -

قائدِ ملّت خواجہ ناظم الدّین

(۱)

پاکستان کے گورنر جنرل قائد ملّت خواجہ ناظم الدّین ڈھاکہ (بنگال) کے نوابی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ موجودہ نواب صاحب ڈھاکہ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں ۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم علی گڈھ میں مسلم یونیورسٹی میں پائی ۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان تشریف لے گئے ۔ وہاں کیمبرج کے ٹرسٹی ہال کالج میں داخل ہوئے اور بیرسٹر بن کر ہندوستان واپس آگئے ۔ بیرسٹری پاس کرنے سے ان کا مقصد سرکاری ملازمت یا وکالت کرنے کا ہرگز نہیں تھا ۔ بلکہ قوم کی خدمت کا جذبہ ان کے دل میں موجزن تھا ۔ اور قوم کو بھی ایک رہنما کی ضرورت تھی

انگلستان سے واپس آتے ہی خواجہ ناظم الدین مسلمانوں کی تعلیمی اور مالی کمزوریوں کو دُور کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ اپنی قومی خدمات کی وجہ سے چند ہی دنوں میں اتنے ہردلعزیز ہوئے۔ کہ ڈھاکہ میونسپلٹی کے صدر مقرر ہو گئے۔ موجودہ زمانہ میں کسی میونسپلٹی یا ڈسٹرکٹ بورڈ کی صدارت ایک معمولی سی چیز ہے۔ لیکن یہ اس زمانہ کا ذکر ہے۔ جب ہندوستانیوں کے لِئے میونسپلٹی کی صدارت عزّت و بہتری کا نشان سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ دوسرے محکموں کے بڑے بڑے عہدے صرف انگریزوں کے لِئے مخصوص تھے۔ میونسپلٹی کی صدارت پر فائز ہوتے ہی ڈھاکہ میونسپلٹی میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی اور غریبوں کو یہ اُمید پیدا ہو گئی۔ کہ اب ان کی تکلیفیں دُور ہونے کا وقت آگیا اور میونسپلٹی کے معاملات میں وہ بھی برابر کے حصّہ دار ہیں۔ خواجہ ناظم الدین نے اپنی صدارت کے زمانے میں رفاہ عام کے کئی کام کئے اور اہل شہر نے اُن کی قومی خدمات کا شکریہ اس شکل میں ادا کیا کہ اُن کے نام پر ناظم الدین ہال اور ناظم الدین روڈ کی تعمیر کرائی۔ یہ دونوں یادگاریں اب تک ڈھاکہ میں موجود ہیں اور ڈھاکہ

میونسپلٹی کے ایک بلند مرتبہ صدر کو ان کی بے لوث خدمات پر خراج تحسین پیش کر رہی ہیں :-

ڈھاکہ کے نوابی خاندان کی کوششوں سے جب سنہ ۱۹۲۱ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی کوششوں سے جب سنہ ۱۹۲۱ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی بنیاد پڑی - تو خواجہ ناظم الدین اس کی انتظامی کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے - یہ یونیورسٹی اصل میں اس لئے قائم کی گئی تھی کہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں تعلیم کو پھیلایا جائے - چونکہ اس وقت پڑھے لکھے مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی - اس لئے اس کے انتظام اور عملہ میں مسلمانوں کا بہت کم حصہ تھا - عربی اور فارسی کے استادوں کے علاوہ اور کوئی مسلمان پروفیسر دکھائی نہیں دیتا تھا - خواجہ ناظم الدین نے مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں اس درسگاہ سے فائدہ اٹھانے کا ولولہ پیدا کیا - اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلم طلبہ کو اس میں داخل ہونے کی ترغیب دی - یونیورسٹی کے مسلمان پروفیسروں کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا -

قائد ملت کی ذات سے کبھی تعصب ظاہر نہیں ہوا اور نہ کبھی آپ نے کسی غیر مسلم کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی البتہ

مسلمانوں کے جائز حقوق کی حفاظت میں کبھی کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کی انتظامی کونسل کے غیر مسلم ممبر بھی آپ کی نیک نیتی اور بے غرضی سے واقف تھے۔ اور آپ کی عزّت کرتے تھے۔

(۲)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ ڈھاکہ کے مسلمانوں کی دعوت پر ڈھاکہ میں ہونا طے پایا اور اس سلسلہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے مالی امداد کی درخواست کی گئی۔ کونسل کے غیر مسلم ارکان اس امداد کے خلاف تھے۔ اُنہوں نے اس مطالبے کے خلاف تقریریں کیں۔ خواجہ ناظم الدین بڑے اطمینان سے اُن کی تقریریں سنتے رہے۔ جب آپ کی باری آئی۔ تو وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور غیر مسلم ممبروں سے کہا "دوستو! یونیورسٹی کوئی امداد کرے یا نہ کرے۔ لیکن یہ طے ہے کہ اس کانفرنس کا اجلاس ڈھاکہ میں ضرور ہوگا۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ایک معقول رقم اس کانفرنس کے لئے منظور کی جائے۔ آپ کی اس امداد سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یونیورسٹی مقروض نہیں ہوگی

دوسرے مسلمان اس احسان کو ضرور مانیں گے۔ اور یہی چیز آگے چل کر یونیورسٹی کے لئے بڑی مفید ہوگی۔"

خواجہ ناظم الدین نے ایسے دلنشین انداز میں تقریر کی کہ مخالفین بھی آپ کے ہم خیال ہو گئے۔ اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو مالی امداد دینے کی تجویز اتفاق رائے سے منظور ہو گئی۔

کونسل کے اجلاس میں بعض وقت ہندو ارکان آپ کے خلاف بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔ لیکن وہ بڑے تحمل اور بردباری سے سنتے رہتے۔ اگر کسی مسلمان ممبر کو غصہ بھی آجاتا۔ تو وہ اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے اور معقول دلیلوں سے کونسل کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں خواجہ ناظم الدین صوبہ بنگال کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ اور ڈھاکہ سے کلکتہ چلے گئے۔ اس عہدے کا چارج سنبھالتے ہی انہوں نے اپنا کام سرگرمی سے انجام دینا شروع کر دیا۔ حسن خدمت، نیک نیتی اور خلوص محبت کی وجہ سے چند دنوں کے اندر اتنی شہرت حاصل کر لی جو شاید کسی دوسرے وزیر کو چار پانچ سال کے بعد بھی حاصل نہ ہوتی

مسلمانوں کو تعلیم میں آگے بڑھانے کا جذبہ زوروں پر تو تھا ہی۔ لیکن وزیر تعلیم بنتے ہی اُنہوں نے اس کام کو مکمل کرنے کی ٹھان لی اور لازمی ابتدائی تعلیم کا بل صوبہ کی کونسل میں پیش کر دیا۔ ویسے تو یہ بل بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر مفید تھا۔ لیکن مسلمان تعلیم میں ہندوؤں سے کہیں پیچھے تھے۔ اس لئے وہ اس سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے تھے اس بل پر بڑی گرماگرم بحث ہوئی اور بنگالی ہندوؤں نے اسے نامنظور کرانے کی پوری پوری کوشش کی۔ لیکن خواجہ ناظم الدین کی سنجیدگی اور بُردباری اس وقت بھی کام آئی اور یہ بل قانون بن گیا۔ اس قانون کے جاری ہوتے ہی مسلمانوں میں تعلیم کا دور دورہ ہو گیا۔ اور چند سالوں کے اندر اندر وہی مسلمان قوم تعلیم پا کر ہندوؤں کے دوش بدوش کھڑی ہو گئی۔ جو اس معاملہ میں حقیر خیال کی جاتی تھی

(۳)

سنہ ۱۹۳۰ء میں بنگال میں مسلم لیگ وزارت قائم ہو گئی اور خواجہ ناظم الدین اس کے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ یہ دور مسلم لیگ کے لئے بڑا نازک تھا۔ بنگال میں کانگریس

مخالف پارٹی بے حد مضبوط تھی۔ اس کے علاوہ اسمبلی کے مسلمان ارکان میں کچھ لوگ کانگریس میں شامل تھے۔ ایسے مسلمانوں کو بس میں کرنا اور انہیں شرارت کا موقع نہ دینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ لیکن ان سب مشکلات کے باوجود خواجہ ناظم الدین نے مسلم لیگی وزارت کو زندہ رکھا اور مخالفین کی یہ اُمید پوری نہ ہو سکی۔ کہ مسلم لیگ وزارت زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکے گی۔

(۴)

جنگ کے بعد ۱۹۴۶ء میں جب اسمبلی کا دوبارہ الیکشن ہُوا۔ تو بدقسمتی سے بنگال کے مسلمانوں میں کچھ پھوٹ سی پڑ چکی تھی۔ یہ دیکھ کر خواجہ ناظم الدین نے الیکشن میں حصّہ نہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ جب آپ کے دوستوں نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ بنگال اسمبلی کے الیکشن میں کامیاب تو ہو جاؤں گا۔ لیکن مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور زیادہ بڑھ جائیں گے میں اپنا ذاتی نقصان تو برداشت کر سکتا ہوں۔ لیکن اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ میری وجہ سے مسلمانوں کو کچھ نقصان پہنچے۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں بنگال کے انتخاب میں مسلم لیگ کو ایک زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور مسٹر حسین شہید سہروردی وزیر اعظم بن گئے۔ مسٹر حسین شہید سہروردی کی وزارت میں کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ اس کے بعد سارے ہندوستان میں فساد کی آگ پھیل گئی۔ اگر وزارت بگڑے ہوئے حالات کو دیکھ کر چوکنا رہتی اور فسادیوں پہ کڑی نگرانی رکھتی۔ تو یہ ناگوار صورت کبھی پیش نہ آتی۔ اور شاید بنگال کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ مگر افسوس کہ حکومت کی باگ ڈور قائد ملت کے ہاتھوں میں نہیں تھی۔

جب بنگال تقسیم ہونے کے بعد مشرقی پاکستان قائم ہو گیا۔ تو وہاں کا انتظام سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ پاکستان کا یہ حصّہ چند مہینے تک بھی زندہ رہ سکے گا۔ اس کے انتظام کے لئے بہت جہاندیدہ اور تجربہ کار شخص کی ضرورت تھی۔ جو مشرقی پاکستان کو بیرونی اور اندرونی سازشوں سے بچا سکے۔ آخر قائد اعظم مرحوم کی دوربین نظریں خواجہ ناظم الدین پر پڑیں۔ اور بنگالیوں کی رائے سے آپ کو مشرقی پاکستان کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ خواجہ ناظم الدین نے وزیر اعظم بن کر

مشرقی پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ کسی ملک کی مضبوطی کا دارو مدار صرف اس کی مالی حالت پر ہی نہیں۔ بلکہ اس کے حکام کی سیاسی سوجھ بوجھ پر بھی ہوتا ہے۔

قائد اعظم کے انتقال کے بعد دشمنوں کا خیال تھا کہ پاکستان میں ان کا جانشین ملنا مشکل ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہی چیز پاکستان کے لیئے تباہی اور زوال کا باعث بن جائے۔ لیکن خدا نے اُن کے مُنہ میں خاک بھر دی - اور خوش قسمتی سے قوم کی نظریں ایسی شخص پر پڑیں۔ جو پاکستان کے ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی سلامتی کے کنارے پر لگا سکتا تھا۔ یہ شخص قائد ملت خواجہ ناظم الدین تھے۔ جنہوں نے پاکستان کے سب سے بڑے عہدہ پر رونق افروز ہو کر دشمنوں کی اُمیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ آپ قائد اعظم مرحوم کے صحیح جانشین ہیں ؛

اگرچہ قائد ملت خواجہ ناظم الدین ایک بڑے گھرانے کے روشن چراغ ہیں۔ لیکن عادات و خصائل کے لحاظ سے بڑے سیدھے سادے انسان ہیں۔ عام طور پر شیروانی اور پاجامہ

پہنتے ہیں۔ بھڑکیلے قسم کے لباس سے آپ کو کوئی رغبت نہیں بلاضرورت کوئی بات نہیں کرتے۔ ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ لیکن بہت ہی سنجیدہ قسم کا۔ آپ کی قومی خدمت کا دامن ہمیشہ سے بے داغ ہے اور انشاءاللہ بے داغ ہی رہے گا۔ آپ کے مخالف بھی آپ کے خلوص۔ نیک نیتی اور دیانت داری کی تعریف کرتے ہیں۔ نماز روزہ کے آپ سختی سے پابند ہیں۔ اردو نہایت پاکیزہ اور صاف بولتے ہیں۔ تفریحات میں اگر کسی چیز سے دلچسپی ہے تو وہ مچھلی کا شکار ہے۔ ٹینس کھیلنے کا بھی بہت شوق ہے۔ اور اس کے لئے وقت ضرور نکال لیتے ہیں ؛

خدا قائد ملت کی عمر میں برکت دے۔ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ ملک و قوم کی خدمت کر سکیں۔

پاکستان زندہ باد

پانچ نئی کتابیں

لڑکے۔ لڑکیوں اور خواتین و حضرات کے لئے اسلامی
لٹریچر پر بہترین کتابیں

محمد بن قاسم یہ اس نوعمر اور تجربہ کار جرنیل کی سرگذشت ہے۔ جس نے سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں سندھ کے طاقتور حکمرانوں کو شکست دیکر اس ملک کو اسلامی ممالک کی صف میں کھڑا کر دیا۔ محمد بن قاسم جب سندھ کے میدانوں میں پہنچا۔ تو وہ ایک لڑکا تھا۔ لیکن سپاہیانہ فن میں اتنا ماہر اور شجاعت اور بہادری میں اتنا بے مثل تھا۔ کہ بڑے بڑے سپہ سالاروں نے اس سے مات کھائی۔ اور اس کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ محمد بن قاسم

ایک تجربہ کار اور پختہ مشق سپاہی ہونے کے علاوہ انتہائی رحم دِل اور منصف مزاج انسان بھی تھا۔ اُس نے اپنی غیر مسلم رعایا سے انصاف اور رواداری کا ایسا برتاؤ کیا کہ تاریخ عالم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مضطر ہاشمی نے اسلام کے اِس مایۂ ناز فرزند کی سرگذشت انتہائی دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔ زبان بیحد سلیس اور واقعات مصدقہ تاریخی حقائق پر مبنی ہیں۔ بڑوں کے علاوہ نونہالانِ قوم بھی اِس کتاب سے استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ عمدہ کاغذ، بہترین چھپائی۔ خوشنما سرورق۔ قیمت صرف ۲ دو روپے

خالد بن ولید رضؓ

قرونِ اولیٰ کا یہ بہادر وہی ہے جسے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و سلم نے سیف اللہ کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ خالدؓ نے اپنے مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ بڑے بڑے سرکشوں کو بیسوں میدانوں شکست دی۔ وہ نہ کبھی دشمن کے ٹڈی دل لشکر سے ڈرے اور نہ اس کے بے اندازہ سامانِ جنگ سے گھبرائے۔ انہوں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی امداد پر بھروسہ کیا اور ہمیشہ کامیاب و کامران ہوئے۔ وُہ دنیا کے سب سے بڑے جرنیل بھی

تھے اور زاہد و متقی بھی۔ برستے ہوئے تیروں اور کوندتی ہوئی تلواروں میں بھی وہ نماز پڑھتے ہوئے دیکھے گئے۔ اس کتاب کو مضطر ہاشمی نے کافی تحقیق کے بعد ایسے دلچسپ اور سلیس انداز میں لکھا ہے کہ چھوٹے بڑے سب اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ یہ کتاب ہر مسلمان گھرانے اور ہر ایک لائبریری میں ہونی چاہیئے اور والدین کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو یہ کتاب پڑھائیں۔ قیمت بہت کم رکھی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی بہت اعلیٰ کاغذ عمدہ۔ سرورق خوشنما قیمت صرف ایک روپیہ ۱۲ ار

سلطان شہید یہ کتاب سلطان ابوالفتح فتح علی المعروف بہ ٹیپو سلطان کے سوانح زندگی پر مشتمل ہے۔ سرزمین دکن کا یہ جانثار اور مجاہد وہی ہے جس نے سب سے پہلے غیر ملکی سامراج کے خلاف تلوار اٹھائی انگریزوں اور فرانسیسوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے جہاد کرتا رہا اس نامور جرنیل نے انگریزوں کی قواعد دان فوج کو کئی میدانوں میں شکست دی۔ اور بڑے بڑے انگریز سپہ سالاروں کو بھاگ کر جان بچانا پڑی۔ غداروں نے کئی دفعہ سلطان کو دھوکا دیا اور سامراجی طاقتوں سے ساز باز کرتے رہے لیکن سلطان کے پائے

استقامت میں قطعاً لغزش پیدا نہ ہوئی مضطر ہاشمی نے سلطان شہید کے حالاتِ زندگی مہیّا کرنے میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔ اور ملّت پاکستان کے سامنے ایک ایسی کتاب پیش کی ہے جو پڑھنے سے تعلّق رکھتی ہے ہر گھر اور ہر چھوٹے بڑے کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔
قیمت صرف ایک روپیہ بارہ آنہ

بزرگانِ اسلام سردارِ دو جہان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی معہ حضور کی سوانح حیات۔ فاروق اعظم رضؓ کی فتوحات۔ عثمان غنی رضؓ کی سخاوت۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شجاعت۔ حضرت امام حسن رضؓ اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی صحبت۔ صحابہ کرام کا ایثار اور دوسرے پیغمبروں کی جانی اور مالی قربانیاں بچّوں کے لئے موثّر پیرائے میں لکھی گئی ہیں۔ اِس کتاب کے مطالعہ سے بچّے بچیوں کے اخلاق اور خیالات پر ایک بہترین اثر ہو گا۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہترین۔ قیمت صرف ایک روپیہ چار آنہ

معصوم افسانے کبھی تم نے آسمان پر سات ستارے دیکھے ہیں۔ اگر تم اِن ہی ستاروں کو آسمان ادب پر دیکھنا چاہو تو اس کتاب کو ضرور منگواؤ۔

یہ بساطِ طبع زاد افسانوں کا لازوال مجموعہ ہے - جب ادبی حلقوں میں ان افسانوں کو پڑھا گیا تو سامعین داد دیئے بغیر نہ رہ سکے - کیونکہ یہ افسانے تمہاری زندگی کا صحیح خاکہ پیش کرتے ہیں -

بچوں کی دنیا میں معصوم افسانے اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے بجا طور پر یہ دعوےٰ کیا جا سکتا ہے - کہ بچوں کے لئے اردو زبان میں آج تک کوئی کتاب اس شان اور اہتمام سے شائع نہیں ہوئی - بچوں کی ننھی منی لائبریریاں اس کتاب کے بغیر نامکمل رہیں گی ۔

بچوں کو انعام دینے کے لئے اس سے بہتر تحفہ اور کوئی نہیں ہو سکتا - سرورق اتنا خوبصورت ہے کہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو جائے گا - لکھائی چھپائی عمدہ - مصنفہ مسٹر نصیر انور - قیمت صرف آٹھ آنہ

پنجاب بک ایجنسی کشمیری بازار لاہور

Municipal

Municipal Library

Nankana Sahib